ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۷ اپریل - ۴ مئی ۱۹۷۲ء

اُٹھو! اسیرانِ بھوک کے نادار قیدیو



منظوم ترجمہ

نقاش کاظمی

محنت کشوں کا بین الاقوامی انقلابی نغمہ

انٹرنیشنل

اُٹھو! سزائے بھوک کے نادار قیدیو

اُٹھو! زمین کی گود کے بدبخت ساکنو!

اُٹھو کہ آنے والا ہے انصاف کا چلن

ہونے کو منصفی کا یہاں بول بالا ہے

دُنیا تے بہترین جنم لینے والی ہے

کٹنے کو ہیں روایتِ کہنہ کی ساتھیو

پیروں میں جو پڑی ہیں وہ ایک ایک بیڑیاں

اُٹھو اے بندگی کے غلاموں بس اب اُٹھو

دم توڑتی ہے رسمِ غلامی و بندگی

اب ہوگا ایک نِت نئی دُنیا کا اہتمام

پہلے جہاں میں تھا نہ ہمارا کوئی وقار

اب ہوگا کائنات پہ اپنا ہی اختیار

یہ جنگ آخری ہے

بس اب آخری ہے جنگ

آؤ کہ ہر کوئی نئی جرأت و عزم سے

بڑھ بڑھ کے آگے مورچہ اپنا سنبھال لے

انسانیت کا ہوگا نقیب "انٹرنیشنل"

یہ جنگ آخری ہے

بس اب آخری ہے جنگ

آؤ کہ ہر کوئی نئی جرأت و عزم سے

بڑھ بڑھ کے آگے مورچہ اپنا سنبھال لے

انسانیت کا ہوگا نقیب "انٹرنیشنل"

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۲ —— شمارہ : ۵۰

۲۷ اپریل - ۴ مئی ۱۹۷۲ء

سرپرست
شوکت صدیقی



مدیر
ارشاد راؤ



نائب مدیر
وہاب صدیقی



آرٹ ایڈیٹر
جی - این - بزمی

سرورق : —— انور سمیع

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون : —— ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

اِسلام آباد کا سیاسی اکھاڑہ

پارلیمانی جوڑ توڑ پورے جوبن پر ہے۔ سیاسی اکھاڑہ اسلام آباد بے پناہ رش لے رہا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی تماشائی بھرپور دل چسپی لے رہے ہیں۔ پہلوان داؤ آزما رہے ہیں۔ ایک جانب پنجاب اور سندھ کے نقشے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی وزارتیں سجی ہوئی ہیں۔ دوسری جانب سرحد اور بلوچستان ہیں۔ پستولوں بندوقوں اور برچھیوں کی دھونس جمائی جا رہی ہے۔

اس اکھاڑے میں اصل کھیل بند کمروں میں ہوتا ہے۔ تماشائی صرف پہلوانوں کی کشتی کے نتائج سننے کے مجاز ہیں۔ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ کس پہلوان نے کیا داؤ لگاتے ہیں۔ کون دم توڑ رہا ہے، کون اکڑ رہا ہے، کسے مار پڑ رہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پہلوان اپنی اپنی جانب سے پٹھوں کو اجازت دیتے ہیں کہ بتا دو۔ "ہماری بات چیت حوصلہ افزاء طور پر آگے بڑھ رہی ہے"

یہ اکھاڑہ گزشتہ چار ماہ سے گرم ہے۔ گرمی اور سردی اس کا مقدّر بن چکی ہے۔ مقصد حصولِ اقتدار ہے۔ گورنر، وزیر چاہئیں۔ بس۔ ورنہ پستولوں بندوقوں اور برچھیوں والے کڑیل جوان تیار ہیں۔

پارلیمانی جمہوریت کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں عوام کو ایک خاص مدّت گزرنے کے بعد ایک دو مہینے کے لئے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اقتدار کے اصل مالک وہی ہیں۔ جس نمائندے کو اپنی قیمتی رائے کے ذریعے منتخب کریں گے، وہ ان کا غلام، خادم اور نوکر ہو گا۔ اُن کے اشارے کا منتظر رہے گا۔ منتخب ہونے کے بعد یہ خادم اور غلام عوام سے تو کوئی واسطہ نہیں رکھتے بلکہ اس عظیم طاقت کو اپنی وراثت اور ملکیت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کے لئے انہیں لڑاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو مضبوط بناتے ہیں۔

یہی حال ان دنوں اسلام آباد کے سیاسی اکھاڑے کا ہے۔ یہ درست ہے کہ پارلیمانی جمہوریت کے مطابق سرحد اور بلوچستان میں اقتدار جمعیت اور نیپ کو بلا تاخیر منتقل ہونا چاہیئے۔ انہیں حکومتیں بنانے کا مکمل حق ہے، اس میں تاخیر کی کوئی وجہ نہیں۔ تاہم ولی خان جن برچھیوں، بندوقوں اور پستولوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ بنگلہ دیش سے سبق حاصل کرنے کی جو تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس پر انہیں بھی غور کرنا چاہیئے کہ بنگلہ دیش میں جنگ آزادی اب شروع ہوتی ہے۔ عوام نے بندوقیں اٹھا لی ہیں، لوک راج کے لئے۔ ولی خان جن بندوقوں کی جانب اشارہ کر رہے ہیں، وہ عوام کے ہاتھوں میں نہیں ہوں گی۔ کیونکہ ولی خان کی قیادت میں مسلّح جدوجہد کا تصوّر ہی فضول ہے ایک جاگیردار اپنے مفادات کے لئے بندوقیں اٹھوا سکتا ہے لیکن وہ عوامی راج قائم نہیں کر سکتا۔ عوامی راج کے لئے ہونے والی مسلّح جدوجہد میں مزدور اور کسان قیادت کریں گے اور پارلیمانی نظام کو زندہ رکھنے والوں کو سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں ملے گی۔

اس موقع پر کسی بھی جانب سے بندوقوں کی محض دھونس، شعبدہ بازی اور عوام دشمنی ہے۔ سیاسی چال ہے، ہوسِ اقتدار کو پورا کرنے کا ڈھنگ ہے۔

پارلیمانی نظام عوام کے مسائل کا حل نہیں۔ مسلّح جد و جہد جاگیرداروں کی قیادت میں نہیں ہو گی۔ انقلاب جاگیردار اور سرمایہ دار نہیں لائیں گے۔ انقلاب لانے کے لئے مزدوروں اور کسانوں کو منظّم ہونا پڑے گا۔ وہ اِس سیاسی اکھاڑے کے تماشائی نہ بنیں۔ انہیں اپنا کھیل کھیلنے دیں۔ اقتدار میں آکر زیادہ ننگے ہوں گے۔ سیاسی کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ عوام کو اِن چالوں سے باخبر رکھیں۔ محلاتی سازشوں سے آگاہ کریں اور انقلابی عمل کو تیز کریں۔ منظّم ہوں۔ متحد ہوں، عوامی راج کے لئے۔ عوامی جمہوریت کے لئے۔



لائلپور کا فوجی اڈہ ۔ ۵۰۰ پونڈ کے وزنی بم ۔ قیامت خیز دھماکہ

یہ مختصر رپورٹ سنڈے ٹائمز کے رپورٹر "مرے سیوائل" نے حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران تیار کی تھی جو ملٹری سنسر شپ کی وجہ سے لندن نہ پہنچ سکی۔ یہ واقعہ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کا ہے، جب لائلپور کے فضائی اڈے پر دو بھارتی طیاروں نے حملہ کیا۔ مرے سیوائل اس واقعہ کا عینی شاہد ہے ——— (ادارہ)

حالیہ جنگ میں ائیر مارشل رحیم خاں بال بال بچ گئے

۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن ہے۔ برِ صغیر پاک و بھارت جنگ کی حالت میں ہے۔ ہوائی حملوں کے پیشِ نظر حفاظتی اقدامات سخت کر دیے گئے۔ راڈار اپنا کام کر رہے ہیں۔ مطلع صاف ہے آسمان پر چیلیں نظر نہیں آتیں۔ فی الوقت کسی ہوائی حملے کا خطرہ نہیں ہے۔ اچانک دو بھارتی بمبار طیارے لائلپور کے ہوائی اڈے پر حملہ کرتے ہیں۔ فضائی سربراہ ایر مارشل رحیم خان اس حملے سے بال بال بچ جاتے ہیں۔

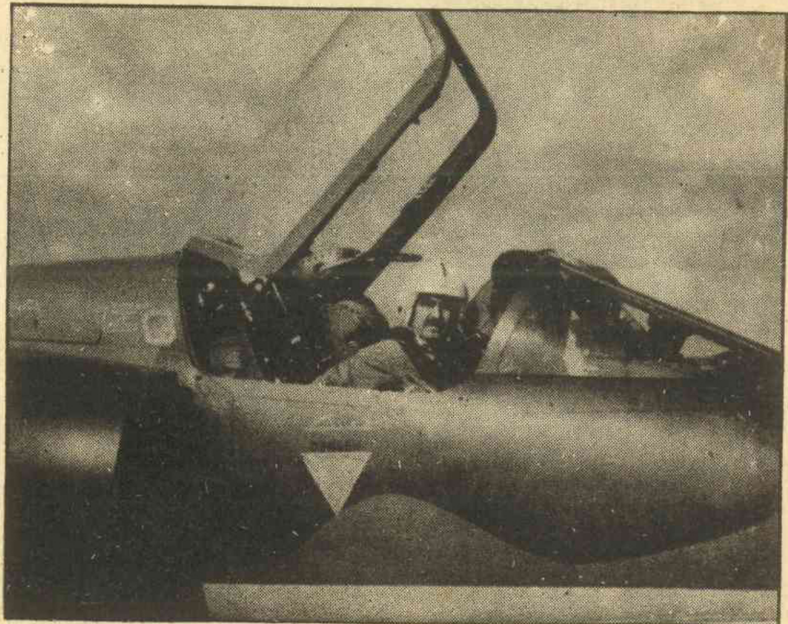
بھارتی فضائیہ کے سربراہ ائیر چیف مارشل پرتاپ چندر لعل، اگر پاکستانی فضائیہ کے سربراہ کو کوئی گزند پہنچتی تو یقیناً خوش نہ ہوتے شاید انہیں خبر بھی نہ تھی کہ دو بھارتی پائلٹ ایس یو۔۷ جب فائٹر کے ذریعہ لائلپور کے ہوائی اڈے پر حملہ کریں گے تو ائیر مارشل رحیم خان اس کی زد میں ہوں گے۔ فضائیہ کے دونوں سربراہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برما میں رائل انڈین ایرفورس کے ساتویں اسکواڈرن میں تھے۔

سنڈے ٹائمز کے رپورٹر مرے سیوائل کے مطابق اس حادثے سے بھارتی فضائیہ کے سربراہ بھی لاعلم تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ پاک فضائیہ کے چند پائلٹ ائیر مارشل رحیم خان اور میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص کچھ نہیں جانتا۔ مرے سیوائل اس وقت فوجی اڈے پر موجود تھا۔ ایر مارشل رحیم خان نے اسے مدعو کیا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کے فضائی حملے کی جو رپورٹ تیار کی۔ اس کے مطابق حالیہ جنگ کا ایک چونکا دینے والا واقعہ منظرِ عام پر آتا ہے۔

ایر مارشل رحیم خان اپنے چھوٹے سے طیارے میں گزشتہ چھ دنوں کے حملے سے فضائی اڈے کے نقصانات کا جائزہ لینے کے لئے چکر لگا رہے تھے۔ صاف ستھرا دن تھا فضائی اڈے کا ہر شخص چاق و چوبند تھا۔ انہوں نے کئی چکر لگائے۔ وہ مطمئن تھے۔ نقصان معمولی تھا۔ پاک فضائیہ کے پائلٹ اس سے کہیں زیادہ ——— بھاری نقصان پہنچا چکے تھے۔ وہ آخری چکر لگا کر رن وے پر اترنے والے تھے کہ اچانک ہوائی حملے کا سائرن بجنے لگا۔ یہ تیز اور مسلسل آواز تھی۔ بھارتی طیارے ہوائی اڈے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ دو پاکستانی ایم آئی جی ۱۹ موجود تھے پائلٹ ہدایت کے منتظر تھے۔ لیکن بد قسمتی سے کمانڈر انچیف کا ریڈیو کام نہیں کر رہا تھا۔ بے موقع بند ہوا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سو فیٹ کی بلندی سے دو بھارتی ایس یو۔۷ لڑاکا طیاروں نے پاک فضائیہ کے ٹھکانے پر حملہ کیا۔ توپ کے دہانے کھل گئے۔ پانچ سو کے وزنی بم بھارتی طیاروں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ پاکستان کی طیارہ شکن توپوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا یہ چین کے تیار کردہ ۳۷ ایم ایم تھے۔

ایر مارشل رحیم خان کا طیارہ رن وے پر اتر گیا۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے غوطہ لگایا اور قریب کے خندق میں کود گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ بھارتی طیاروں نے ۵۰۰ پونڈ کے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



سابق ایر مارشل رحیم خاں اپنے طیارے میں

احوالِ واقعی





نیپ کو اپنی مصنوعی اکثریت کے ٹوٹ جانے کا دھڑکا

ڈی۔ پی دھر خطرناک ڈپلومیٹ — عزیز احمد — محض بیوروکریٹ

واقفِ حال

ایلچیوں کی سطح پر بات چیت کرنے کے لئے اندرا گاندھی کے ایلچی درگا پرشاد دھر ۲۶ اپریل کو راولپنڈی پہنچ رہے ہیں۔ مری کی خوش گوار فضاؤں میں پاکستان کی طرف سے وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل عزیز احمد بات کریں گے۔ صدر کے معاون خصوصی رفیع رضا ان کی مدد کریں گے۔ مری کی فضا ہر چند کہ خوشگوار ہے۔ لیکن مذاکرات میں طے ہونے والے مسائل بڑے تلخ ہیں۔ کئی برس ہونے والی افسروں کی سطح کی اس بات چیت میں آئندہ ماہ ہونے والی اندرا بھٹو ملاقات کے لئے ایجنڈا طے کیا جائے گا۔ اس ملاقات میں زیر بحث آنے والے امور میں سرفہرست یہ ہوں گے۔

۱: پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی۔

۲: بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ۔

۳: بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ۔

۴: مسئلہ کشمیر کی حیثیت۔

۵: پاکستان اور بھارت کے درمیان تجارتی تعلقات کی بحالی۔

مسز اندرا گاندھی کے ایلچی درگا پرشاد دھر بڑے خطرناک ڈپلومیٹ ہیں۔ انہوں نے بھارتی وزارت خارجہ کے پاکستان ڈیسک پر مسلسل کام کیا ہے۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان ڈیسک ان کے ذمے تھا۔ سنا ہے کہ وہ بنگالی بھی بڑی روانی سے بول سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی زبانوں کے ماہر ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا اس وقت سے ہی ان کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ لسانی، جغرافیائی، ثقافتی اور سیاسی امور کا جائزہ لیتے رہیں اور اس بات کے امکانات کا جائزہ لیں کہ دو قومی نظریے کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ ڈی۔ پی۔ دھر نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی تحقیقات کا نتیجہ ۲۵ سال بعد برآمد ہو گیا ہے اور وہ اب ایک فاتح کی حیثیت سے اسلام آباد تشریف لا رہے ہیں۔ وہ آنے سے پہلے "بنگلہ دیش" کے حکام سے بھی بات کر کے آ رہے ہیں۔ بنگلہ دیش والے تو کیا شرائط پیش کریں گے۔ انہوں نے خود بنگلہ دیش حکام کو بہت سے گر سکھائے ہوں گے۔ ڈی۔ پی۔ دھر روس بھی ہو کر آ چکے ہیں۔ انہوں نے تمام ممکنہ امور کا جائزہ پہلے سے لیا ہو گا۔ انہیں حالات کا سہارا بھی حاصل ہے۔ اس لئے وہ اپنا ہاتھ اوپر رکھیں گے۔

ڈی۔ پی۔ دھر کے بارے میں اتنی تفصیل سے بات چیت اس لئے کی جا رہی ہے کہ ان کی شخصیت کا ان مذاکرات پر یقیناً اثر پڑے گا۔ بھارت کی بیوروکریسی ہر چند کہ اپنے ملک کے عوام کے لئے بیوروکریسی کا درجہ ہی رکھتی ہے۔ لیکن یہ بیوروکریسی قوم پرست ضرور ہے۔ بیرونی ممالک سے تعلقات اور مذاکرات میں وہ ہمیشہ بھارت کے قوم پرستانہ مفادات کو سامنے رکھتی ہے اور کسی بین الاقوامیت کا شکار نہیں ہوتی۔ اسی قوم پرستی کی روح کے باعث بھارت کو بیرونِ ملک پروپیگنڈے میں انتہائی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ بھارت نے اپنے موقف سے دنیا بھر کو روشناس کروا دیا ہے۔ ہماری بیوروکریسی نہ جانے اس قوم پرستی کی روح سے کیوں عاری رہی۔ انہوں نے اپنا وقت عیاشی میں گزارا اور بیرونِ ملک پاکستان کا موقف پیش کرنے کی کوئی زحمت نہ کی۔

صدر پاکستان کے ایلچی جناب عزیز احمد بھی یوں تو پرانے ڈپلومیٹ ہیں۔ اب تک وہ کئی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں کئی اہم ملکوں میں انہوں نے سفارتی خدمات انجام دی ہیں! و اس گفتگو سے پہلے وہ کئی غیر ممالک کا مسبوط دورہ بھی کر کے آئے ہیں۔ صدر بھٹو کے ساتھ کئی دوروں میں جا چکے ہیں۔ مگر وہ اتنے خطرناک اور گھاگ ڈپلومیٹ نہیں ہیں۔ جس کے لئے ڈی پی دھر مشہور ہیں۔ ویسے بھی بھارت کے فارن آفس نے جس طرح پاکستان کا ہمہ گیر، گہرا، تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ ایسا پاکستان نے نہیں کیا۔ اس طرح ہمارے فارن آفس والوں میں پاکستان کے لئے قوم پرستانہ جذبات کا بھی کبھی مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اسے نوکری سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ڈی۔ پی۔ دھر اب تک جانے کتنی مرتبہ غیر ملکی اخبار نویسوں کے ذریعے ان متوقع مذاکرات کے سلسلے میں بھارت کا موقف براہِ راست اور بالواسطہ پیش کر چکے ہیں — غیر ملکی اخبار نویسوں کو دھر صاحب کی اس بات چیت کے ذریعے پہلے سے بہت سی معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی تحریروں اور خبروں میں بھارت کی طرف ان کا جھکاؤ یقینی ہو گا۔ ہمارے ہاں اب تک عزیز احمد صاحب

مرزا رفیع رضا۔ اچھے ڈرافٹسمین ہیں مگر امورِ خارجہ سے کیا سروکار؟

نے غیر ملکی اخبار نویسوں یا ملکی اخبار نویسوں سے کوئی ملاقات کی ہے اور نہ پہلے سے اپنے موقف کو براہِ راست یا بالواسطہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ صدر صاحب نے آج (اتوار۔ ۲۳ اپریل ۱۹۷۲ء) شاید غیر ملکی اخبار نویسوں کو عشائیہ دیا ہے۔ اس میں وہ کچھ نہ کچھ بات چیت کریں گے۔ مگر فارن آفس کی طرف سے ایسا اب تک نہیں ہوا ہے۔

ڈی۔ پی۔ دھر کے مقابلے کے لئے جب کہ وہ ایک فاتح اور طاقت ور ملک کے ایلچی کی حیثیت سے آرہے ہیں۔ نہایت محتاط اور ہوشیار رہ کر بات چیت کرنے کی ضرورت ہوگی۔ صدر کے معاون خصوصی رفیع رضا ان کی مدد کر رہے ہیں۔ رفیع رضا اچھے ڈرفٹسمین ضرور ہیں۔ مگر امورِ خارجہ کا انہیں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ عزیز احمد صاحب کا بریف کیس سنبھال سکتے ہیں یا ان کے لئے خط وغیرہ ڈرافٹ کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈی۔ پی۔ دھر کے سفارتی داؤ پیچ پچھاڑنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

امید تو یہی ہے اور دعا بھی کہ یہ ایلچیوں کی سطح کی بات چیت بخیر انجام ہو۔ اور اندرا بھٹو ملاقات کے لئے وقت اور مقام طے ہوجائے۔ ورنہ خطرات بہت ہیں۔ بھارت کی طرف سے دباؤ یہ ڈالا جا رہا ہے کہ پاکستان پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔ پھر جنگی قیدی واپس کئے جا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک امریکی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے وقت اندرا نے یہ شرط لگائی ہے کہ جنگی قیدی اس وقت واپس کئے جائیں گے۔ جب بھارت کو یہ یقین ہوجائے کہ یہ ایک لاکھ تربیت یافتہ افراد ایک ایسے پُرامن ملک کو جا رہے ہیں جو ہم سے جنگ نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ بھٹو صاحب جب روس سے لوٹے "الفتح" نے اس وقت یہی لکھا تھا کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا اور بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے گا۔ روس نے یہی شرائط عائد کی ہیں۔ اب یہ بات جلد طے ہو یا بدیر۔ بہر حال یہ ہونا ہے۔ صدر بھٹو نے راولپنڈی کے "جشن حلف برداری" میں بھی کہا کہ ہم نے بے مقصد تین جنگیں لڑی ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ دونوں ملک اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں۔ کہ جنگ سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوا اور اب دونوں ملکوں کو امن و امان سے رہنا چاہیئے۔ مسئلہ اب "پہلے" اور "بعد" کا ہے "بنگلہ دیش" پہلے تسلیم ہو یا جنگی قیدی پہلے واپس ہوں تو بنگلہ دیش تسلیم ہو۔ دونوں کام بیک وقت اس صورت میں ہوسکتے ہیں کہ کوئی تیسری طاقت درمیان میں ضامن کے طور پر موجود ہو۔ تیسری طاقت کون سی ہوسکتی ہے یہ بھی افسروں کی سطح کی بات چیت میں ہی زیر غور آئے گا۔

یہ تو بیرونی معاملہ تھا۔ اب رہا اندرونی معاملہ جب بھارت سے بات چیت کا وقت قریب آنے لگتا ہے، تو نیپ اور پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات شدید ہونے لگتے ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہے یا سوئے اتفاق۔ بہر حال اس کا اتفاق ضرور ہوتا ہے۔ نیپ سے پھر گورنروں کے مسئلے پر کچھ اختلاف پیدا ہوا ہے۔ نیپ کے لیڈر جو قومی لیڈر بننے کی کوششوں میں ہیں۔ سیاسی جنگ میں وہ پہلے عوام سے مار کھا چکے ہیں کہ انہیں عوام نے، اُن کے اپنے صوبوں میں بھی واضح اکثریت میں منتخب نہیں کیا۔ دوسری طرف وہ بھٹو سے مار کھا رہے ہیں۔ ان کے پاس قومی اسمبلی میں بھی واضح اکثریت ہے۔ اپنے دونوں صوبوں سندھ اور پنجاب میں بھی انہیں واضح اکثریت حاصل ہے۔ سیکولر نیپ کو ایک طرف تو اکثریت میں آنے کے لئے جمعیتِ علمائے اسلام جیسی کٹر مذہبی جماعت کا سہارا لینا پڑ رہا ہے اور اس کی ہر شرط بھی ماننا پڑی ہے۔

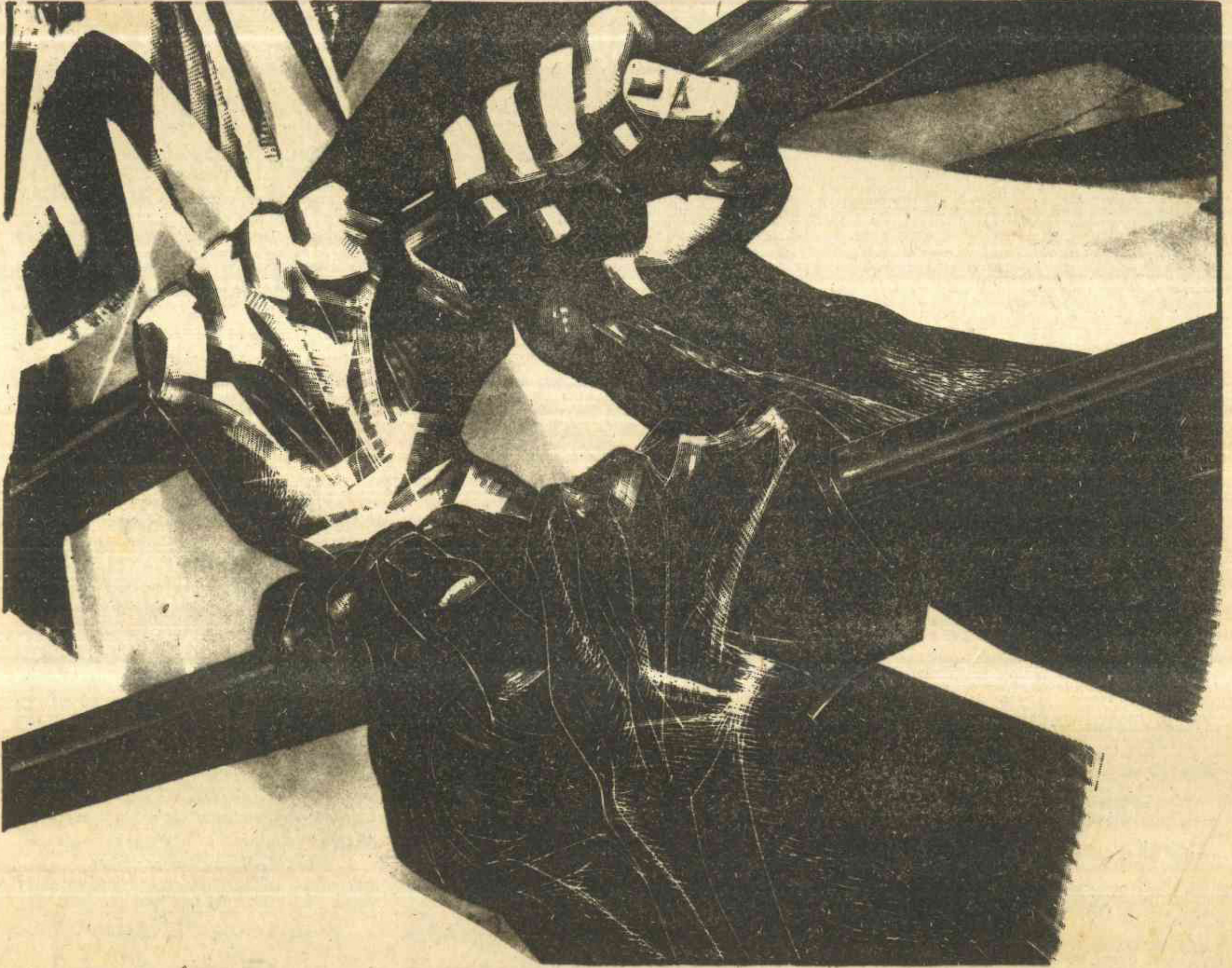
سیکولر نیپ
مذہبی جمعیت
کا سنگم
کیسے ہوگا

کہ وہ ۴۲ میں سے صرف ۴ سیٹیں رکھنے کے باوجود وزارت اعلیٰ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ نری سودے بازی ہے ورنہ ۴ سیٹوں کی وجہ سے کبھی بھی وزارتِ اعلیٰ انہیں مل سکتی تھی۔ جمعیت نے کھلم کھلا یہ کہا تھا کہ سرحد میں جمعیت صرف اس جماعت سے تعاون کرے گی جو وزارت اعلیٰ کا عہدہ جمعیت کو دے۔ ایک سیکولر اور ایک کٹر مذہبی جماعت (اگرچہ قوم پرست) کا یہ گٹھ جوڑ پرانی سیاست کی مثال ہے۔ اور اگر بیچ میں سے جمعیت کو توڑ لیا جائے تو نیپ ہوا میں لٹکتی رہ جاتے۔ قیوم خاں کے وزارت میں آنے سے نیپ کو اور خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ۱۴ مئی سے پہلے ہی جوڑ توڑ سے سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی اکثریت ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اپنے صوبوں میں تو ولی خان کی بنیادیں ہل رہی ہیں، مگر وہ پنجاب کا رُخ کر رہے ہیں۔ ان پر قومی لیڈر بننے کا شوق سوار ہے۔ پنجاب کی زمین کو وہ اس کے لئے سازگار سمجھتے ہیں، مگر بھٹو بھی پنجاب کو اتنی آسانی سے کسی اور کے ہاتھوں میں جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے ۱۴ اپریل کے ڈرامائی اعلان کے ذریعے مارشل لا ختم کر کے پنجاب میں پھر اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔

نیپ کے یہ خطرات اپنی جگہ۔ مگر اب جب کہ صوبائی گورنروں کے سلسلے میں پھر تعطل پیدا ہوا ہے تو اس میں پیپلز پارٹی کی زیادتی بھی ہے۔ یہ تسلیم کہ گورنر صدر کے نمائندے ہوتے ہیں مگر وزرائے اعلیٰ کو جہاں مکمل انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہاں گورنر عام طور پر غیر سیاسی ہوتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں اگر پیپلز پارٹی کے رہنما گورنر مقرر ہوتے ہیں تو جہاں بلوچستان اور سرحد کی اکثریتی پارٹیوں کا اس کے بعد یہ مطالبہ برحق ہے کہ اُن کے صوبوں میں ان کے گورنر مقرر کئے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ دقت بھی ہوگی کہ غلام مصطفےٰ کھر جو پنجاب میں مکمل اختیارات والے گورنر رہ چکے ہیں۔ اب محض دستوری سربراہ کی حیثیت سے کیسے گزارہ کر سکیں گے۔ جب کہ اُن کے وزیر اعلیٰ کو وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو انھیں گورنر کی حیثیت سے تھے۔ اس طرح پارٹی کے اپنے افراد کے درمیان بھی مسلسل آویزش جاری رہے گی۔ ان خطرات کو ٹالنے کی اشد ضرورت ہے۔ ادھر نیپ اور بعض دوسرے عناصر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ پھر اختلافات شدید ہوجائیں تاکہ بھارت سے بات چیت میں پھر تعطل پیدا ہو، اس وقت صدر بھٹو کو جو اعتماد حاصل ہے اور اپوزیشن بھی ان کی قیادت پر اعتماد ظاہر کر چکی ہے۔ اس وقت بھارت سے بات چیت کرنے میں اُنھیں جو قوت حاصل ہے، وہ کسی طرح مجروح ہو۔ ان عناصر کی کوششوں کو ناکام اسی صورت میں بنایا جا سکتا ہے کہ نیپ، جمعیت اور پیپلز پارٹی گٹھ جوڑ چھوڑ کر اصولوں کی بات کریں۔ گورنر کسی پارٹی سے نہ ہوں۔ جس جس کی اکثریت ہے۔ وہ حکومت بنائے۔ اسمبلی اسی لئے ہوتی ہے۔



دُنیا بھر کے مزدُورو — ایک ہو جاؤ



ہم کچھ نہیں تھے اب سب کچھ ہو جائیں گے، یہ آخری جنگ ہے

وہاب صدیقی

بہادری سے آگے بڑھے چلو!
لڑائی شروع ہو چکی ہے۔

مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے۔ سرمایہ داری کے خونی پنجے قانون اور بے جان امن کے کھوکھلے

پردوں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔

محنت کشو!

تمہارا نعرہ اب یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ پہلی مئی کی تاریخی اہمیت تو آنے والے زمانہ میں تسلیم کی جائے گی۔ یہ تمہارے حقوق طلب کرنے کا دن ہے۔ یہ بات اچھی طرح جان لو کہ سرمایہ دار بغیر لڑے ہوتے کام

کے گھنٹے کم نہیں کریں گے۔"

یکم مئی ۱۸۸۶ کو شکاگو کے ایک اخبار میں یہ لافانی اور تاریخ ساز الفاظ چھپے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کس انقلابی صحافی کے الفاظ ہیں۔ اس پر گمنامی کے دبیز پردے پڑے ہوتے ہیں۔ شکاگو کے مزدوروں نے اپنا لہو دے کر شکاگو کو خون سے رنگین کر کے اور دار و رسن کی آزمائشوں سے

محنت کشوں کو استحصالی نظام کا تختہ اُلٹنے کا حق ہے

گزر کران الفاظ کو امر اور زندہ جاوید بنا دیا۔ شکاگو کے محنت کشوں کی تحریک افق تا اُفق پھیلتی چلی گئی بیلجیئم کی کانوں سے کیلیفورنیا کے ساحل تک۔ یورپ، امریکہ، لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے کروڑوں مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں کے دلوں کو گرما گئی۔ آج محنت کشوں کی تحریک کا مقصد آٹھ گھنٹے کام آٹھ گھنٹے روزمرہ کے مشاغل آٹھ گھنٹے نیند" نہیں، اپنی اجرتوں میں چند سکوں کا اضافہ کرانا نہیں اور نہ ہی چند مراعات کا حصول ہے۔ بلکہ ریاستی اداروں پر اپنی آمریت قائم کرنا ہے۔ غیر طبقاتی اور استحصال سے پاک معاشرہ کے قیام کے لئے انقلاب برپا کرنا ہے۔ ایسا انقلاب جو ایک تشدد آمیز عمل ہے۔ جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا تختہ الٹتا ہے۔

جب یورپ میں صنعتی انقلاب کا سورج طلوع ہوا تو گھریلو اور دستی صنعت کاری تباہ ہو گئی۔ گھریلو صنعت کار جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اپنی محنت فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرمایہ دار راتوں رات مزید دولت جمع کرنے کے لئے مزدوروں سے اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹے کام لینے لگے۔ عورتوں اور کم سن بچوں سے ۱۶ گھنٹے کام لیا جاتا۔ ہفتے میں ایک چھٹی تو در کنار تہوار کے دن بھی چھٹی نہیں دی جاتی۔ برطانیہ میں مزدوروں کے اوقات کار کا ذکر کرتے ہوئے کارل مارکس "داس کیپٹل" میں لکھتے ہیں۔

• رسم و رواج، عمر و جنس، رات دن کی تمام قیود مٹا دی گئیں۔ شب و روز کی سادہ اور دیہاتی تقسیم ختم کر دی گئی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں ایک برطانوی جج کو آئینی طور پر دن اور رات کی تقسیم میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ سرمایہ بے پناہ مظالم کر رہا تھا۔ •

برطانیہ کے صنعتی مزدوروں نے "آئینی" اور "پرامن" ذرائع سے اپنے اوقات کار میں کمی کرانے کے لئے ۲ اگست ۱۸۴۲ء کو برطانوی پارلیمان میں ایک یادداشت پیش کی۔ اس پر ساڑھے تین لاکھ مزدوروں کے دستخط تھے۔ پارلیمان نے اس یادداشت کو مسترد کر دیا۔ صرف ایک رکن نے محنت کشوں کے مطالبات کی حمایت میں تقریر کی۔ جس کا اختتامیہ جملہ یہ تھا۔

• اس پارلیمنٹ سے اپیل کرنا ایسا ہے جیسے جبل الطارق کی چٹانوں سے رحم کی درخواست کرنا۔ •

برطانوی پارلیمنٹ نے محنت کشوں کی یادداشت مسترد کیوں کی؟ وجہ صاف ظاہر ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں تمام ریاستی ادارے "آئین ساز ادارے۔ قانون ساز ادارے، اسمبلیاں، پارلیمان، پولیس، انتظامیہ، نوکر شاہی اور قانون سبھی استحصالی نظام کے کل پرزے ہوتے ہیں۔ ان اداروں کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو برقرار رکھنا ہے چنانچہ آدم اسمتھ جو سرمایہ دارانہ نظام کا حامی تھا، یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

• جب مجلس قانون ساز مالکوں اور مزدوروں کے فرق میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تو یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اس کے ارکان دراصل مالکان کے طبقے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ •

جب پارلیمان کے ارکان ملز مالکان اور سرمایہ دار ہوں تو وہ کس طرح مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

امریکہ کے صنعتی مزدوروں کی حالت بھی، برطانیہ کے مزدوروں جیسی تھی۔ ان سے بھی اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ "پرامن ذرائع" سے جب سرمایہ داروں نے محنت کشوں کے اوقات کار میں کمی نہ کی تو مزدور سڑکوں پر نکل آئے۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو ان کے راستے بدل گئے تھے۔ کارخانوں اور صنعتی اداروں کی بجائے سڑکیں، گلیاں اور کوچے ان کی جدوجہد کا مرکز بن گئے تھے۔ اس دن امریکہ کے سب سے بڑے صنعتی شہر شکاگو محنت کشوں کے قدموں کی چاپ سے گونج رہا تھا۔ مزدوروں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر نے کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دیے۔ سرمایہ داروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ سرمایہ داروں کی گماشتہ حکومت اور پولیس نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے منظم منصوبے بنائے۔ ۳ مئی کو میکارمک ولیمروس نامی ادارے کے پرامن ہڑتالیوں پر پولیس نے حملہ کر کے پانچ مزدوروں کو شہید اور سینکڑوں کو زخمی کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو کسی نہ کسی طرح اشتعال دلایا جائے۔ اس سے اگلے روز رانڈ رالف مارکیٹ میں مزدوروں نے ایک احتجاجی جلسہ کیا اور پولیس کے جبر و تشدد کی مذمت کرتے ہوئے مطالبات تسلیم کئے جانے تک ہڑتال جاری رکھنے کا عزم کیا۔ پولیس نے اس جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ سرمایہ داروں کے ایک زر خرید غنڈے نے ایک دستی بم پولیس پر پھینکا۔ جس سے ایک سارجنٹ ہلاک ہو گیا۔ پولیس تو پہلے ہی بہانہ کی منتظر تھی۔ اس نے اپنی بندوقوں کا رخ محنت کشوں کی جانب موڑ دیا۔ نحیف و نزار، بھوک اور افلاس زدہ مزدوروں نے بھاگنے کی بجائے سینہ سپری کی راہ اختیار کی۔ شکاگو کے مزدوروں نے پولیس سے ٹکر لی۔ مظلوم کا ہاتھ ظالموں کے گریبانوں تک پہنچا۔ آدھے گھنٹے کی لڑائی میں چار مزدور شہید اور پولیس کے سات افراد ہلاک ہو گئے۔ شکاگو کے جیالے محنت کشوں نے سڑکوں پر بہنے والے اپنے شہید ساتھیوں کے لہو سے ایک پرچم رنگ لیا اور اگلے روز پھر شکاگو کے در و بام محنت کشوں کے نعروں سے ہل رہے تھے۔ اس دن فضا میں ایک سُرخ پرچم لہرا رہا تھا جو کہ مزدوروں اور محنت کشوں کی تحریک کی علامت تھا۔ مظلوموں کی جدوجہد کا لافانی اور ابدی نشان تھا۔ پھر یہ پرچم بلند سے بلند ہوتا گیا۔ کیونکہ محنت کشوں کا پرچم بلند سے بلند تر ہونے کے لئے ہے، سرنگوں ہونے کے لئے نہیں، اور پھر یہ پرچم زمان و مکان کی حدود اور قید سے آزاد ہو کر دنیا کی وسعتوں میں پھیل گیا۔ جہاں بھی یہ پرچم گیا۔ اس نے محنت کشوں کو اتحاد، جدوجہد کا درس دیا اور روشن مستقبل کا مژدہ سنایا۔

امریکی سرمایہ داروں اور حکمرانوں نے مزدوروں کی تحریک کو کچلنے کے لئے مزدوروں کے پانچ رہنماؤں فشر، رابرٹ اینجل، سپارٹیز اور پارسنز کو سزائے موت سنا دی۔ ان جیالوں نے تختہ دار پر جو نعرہ مستانہ بلند کیا۔ اور حق و صداقت کے جو چراغ روشن کئے۔ وہ آج بھی روشن ہیں بلکہ ان کی تابناکی بڑھتی جا رہی ہے۔

فشر نے پھانسی کا پھندہ چومتے ہوئے کہا

"یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک اچھے کام کے لئے جان قربان کر رہے ہیں۔"

اینجل نے پکارا!

"تم ہمیں مار سکتے ہو لیکن ہماری تحریک کو نہیں مار سکتے ہماری تحریک تمہاری موت کا پیغام بن کر ابھری ہے۔"

رابرٹ نے للکارا!

"تم اِس آواز کو بند کر سکتے ہو لیکن وقت آئے گا جب ہماری خاموشی ہماری آواز سے بھی زیادہ زوردار ہو گی۔"

سپارٹیز نے پیش گوئی کی!

"سرمایہ دارو! کیا مجھے بھی بولنے کی اجازت ہے۔ حاکمو! غریب انسانوں کی آواز بلند ہونے دو۔ ورنہ پھر ان کی تلواریں بلند ہوں گی۔ ان اٹھی ہوئی تلواروں کو دنیا کی

الفتح

کوئی طاقت نہیں جھکا سکے گی۔"

مقام حیرت ہے کہ یہ واقعہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد ایک ایسے ملک میں کیا گیا۔ ایسے حاکموں نے کیا جس ملک کے مقبول ترین صدر۔ لنکن نے یہ کہا تھا۔

"ہر جگہ کے عوام کو حق حاصل ہے کہ علم بغاوت بلند کر دیں اور موجودہ حکومت کا تختہ الٹ کر ایک ایسی نئی حکومت، جوان کے نزدیک زیادہ بہتر ہو، بنالیں۔ یہ بہت گراں بہا اور مقدس حق ہے۔ ایسا حق جس سے ہم امید کرتے ہیں کہ دنیا کی آزادی کا موجب ہو سکتا ہے۔"

سرمایہ داروں اور استحصالی طبقوں کا ظلم دن بدن بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں سپارٹیز کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ روس کے محنت کشوں نے عظیم لینن کی قیادت میں تلواریں بلند کیں اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جب کرخت، کھردرے اور سخت ہاتھوں نے تلواریں بلند کیں تو زار روس دنیا کے تمام استحصالی طبقوں کی امداد اور حمایت کے باوجود ان کی تلواروں کو جھکا نہیں سکا۔

اب یکم مئی دنیا بھر کے مزدوروں اور انقلابیوں کے لئے جدوجہد کی علامت بن گیا ہے۔ یہ بین الاقوامی پرولتاری انقلاب کا نقیب ہے۔ امریکی سامراج اور اس کے ایجنٹ اس انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی دیوار ہیں۔ وہ دنیا پر ایک نئی جنگ مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے "ایک نئی عالمی جنگ کا خطرہ اب بھی موجود ہے۔ تمام ممالک کے عوام کو اس کے خلاف تیاریاں کرنی چاہئیں تاہم اس وقت دنیا کا رجحان انقلاب کی جانب ہے۔" دنیا بھر کے عوام افکار ماؤزے تنگ اور بندوقوں سے لیس ہو کر بندوقوں کے کندوں سے آزادی کے دریچوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، فلسطین، افریقہ لاطینی امریکہ، کوریا، اوکی ناوا، بھارت اور بنگلہ دیش کی تحریکات آزادی میں شکاگو کے شہیدوں کی روح ہی کام کر رہی ہے۔ چھوٹے اور درمیانے درجہ کے وہ ممالک جن کو امریکی سامراج اور سوشل سامراج نے مالی امداد دے کر اپنا حلقہ اسیری میں لے لیا تھا۔ اب ان ممالک کے محنت کش شکاگو کے مزدوروں کی راہ عمل کو اپنا کر بین الاقوامی پرولتاری تحریک میں شامل ہو رہے ہیں۔ خود امریکہ میں عوام اور نوجوان نسل جارحیت سے تنگ آ کر بغاوت کر رہی ہے۔ امریکی سامراج اپنی شکستہ کشتی کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

بابائے اشتراکیت کارل مارکس نے کمیونسٹ پارٹی کے منشور میں

"دنیا بھر کے مزدور و متحد ہو جاؤ۔"

کا نعرہ دیا۔ لیکن جب سرمایہ داری اپنی انتہائی شکل میں سامراجیت کے مرحلہ میں داخل ہوئی تو عظیم لینن نے "دنیا بھر کے مزدورو اور مظلوم قومو متحد ہو جاؤ" کا نعرہ لگایا اور بتایا کہ سامراجیت کا خاتمہ اور عالمی پرولتاری انقلاب برپا اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک مظلوم اور نوآبادیاتی ممالک کے عوام سرمایہ دار ممالک کے خلاف متحد نہیں ہو جاتے اور عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے چینی انقلاب کو عالمی انقلاب کا ایک حصہ قرار دیتے ہوئے عوام کو ہدایت کی "وہ عوام جنہوں نے اپنے ہاں انقلاب کا نقارہ بجایا ہے۔ انہیں ان اقوام کی مدد کرنی چاہیئے جو آزادی کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ یہ ہمارا بین الاقوامی فریضہ ہے۔"

لیکن بدنصیبی سے ابھی تک پاکستان کے محنت کش بین الاقوامی پرولتاری تحریک کا حصہ نہیں بن سکے۔ اس کی وجہ نام نہاد اور اجارہ دار مزدور رہنما ہیں۔ جو اپنی دکان سجانے کے لئے مزدوروں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع تر کر رہے ہیں۔ رجعت پسند مزدور رہنما کو چھوڑیے، ان سے تو کوئی شکوہ

محنت کشوں کے
سرخ پرچم کی
سربلندی میں
دنیا کی آزادی کا
راز مضمر ہے

نہیں۔ ترقی پسند اور انقلاب کے داعی مزدور رہنما بھی باصلاحیت اور باشعور مزدور کو آگے بڑھانے کی بجائے اپنی لیڈری برقرار رکھنے کے لئے ہمہ تن جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ باشعور مزدور کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا کیونکہ اس سے ان کی لیڈری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ خود ساختہ انقلاب پسند مزدور رہنماؤں نے مزدور تحریک کو صحیح خطوط پر چلانے کی بجائے اسے ٹریڈ یونین ازم تک محدود کر دیا ہے اور مزدوروں کو معیشت پسند بنانے کی فکر میں ہیں۔ ان رہنماؤں کی پوری جدوجہد تنخواہوں کے اضافے اور چند دیگر مراعات کے دائرے میں گھومتی ہے۔ "اصولی اتحاد" اور "صنعتی امن" ایسی غیر انقلابی اصطلاحات کا سہارا لے کر استحصالی نظام کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ انتظامیہ اور مزدوروں کا "اصولی اتحاد" کیسے ہو سکتا ہے انتظامیہ محنت کشوں کا استحصال کرتی ہے۔ استحصال زدہ طبقوں اور استحصالی طبقوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اور تجربات نے یہی سبق دیا ہے۔

وطن عزیز میں مزدور تحریک کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غلط قیادت کی وجہ سے مزدوروں اور کسانوں میں کوئی رابطہ نہیں۔ پاکستان ایک نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ ملک ہے۔ ۸۰ فی صد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے یہ آبادی ایک فعال اور طاقت ور قوت کی حیثیت سے ابھر سکتی ہے۔ لیکن مزدوروں سے جو کہ انقلاب کے ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ کوئی تعلق اور رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے بے حس و حرکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں چلنے والی کسی بھی تحریک میں کسانوں نے کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کیا۔

یکم مئی عہد تجدید کا دن ہے۔ شکاگو کی سڑکوں پر بہنے والا خون پیغام دے رہا ہے اور پاکستان کے مزدور طبقے کو اُن کا تاریخی کردار یاد دلا رہا ہے کہ محنت کشوں کی نجات صرف ٹریڈ یونین کے ذریعے معاشی سودے بازی میں نہیں بلکہ موجودہ استحصالی نظام کے خاتمے میں مضمر ہے۔ پاکستان کے مزدوروں کسانوں، محنت کشوں کا بنیادی اور اولین فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک، اپنی جدوجہد کو بین الاقوامی پرولتاری تحریک سے ہم آہنگ کریں اور عالمی پرولتاری راہ عمل اختیار کریں۔

دیکھئے انقلابیوں کا بین الاقوامی ترانہ "انٹرنیشنل" جسے تقریباً سو سال پیشتر کمیون کے انقلابیوں نے گایا تھا۔ ہمیں دعوت دے رہا ہے۔

"اے بھوک و ناداری کے قیدیو اٹھو۔
اے زمین کے بدبختو اٹھو۔
کیونکہ اب انصاف کا بول بالا ہونے والا ہے۔
ایک بہتر دنیا جنم لینے والی ہے۔
اب روایات کی بیڑیاں ہمارے پیروں میں نہیں رہیں گی۔
اے غلامو اٹھو! اب غلامی اور بندگی دم توڑ رہی ہے۔
دنیا اب نئی بنیادوں پر استوار ہو گی۔
ہم کچھ نہیں تھے۔ اب سب کچھ ہو جائیں۔
یہ آخری جنگ ہے۔
آؤ ہم میں سے ہر ایک اپنا اپنا مورچہ سنبھال لے۔
انٹرنیشنل انسانیت کا نقیب ہو گا۔
یہ آخری جنگ ہے۔
آؤ ہم میں سے ہر ایک اپنا اپنا مورچہ سنبھال لے۔
انٹرنیشنل انسانیت کا نقیب ہو گا۔"

سلام

سحر انصاری

سلام پہنچے
شہید محنت کشوں کو دل کا سلام پہنچے

پیام پہنچے
تمام زندوں تک آج دل کا پیام پہنچے

جو راہِ عظمت میں کام آجانے والے محنت کشوں کی یادوں کے کارواں کو
لہُو کی مشعل کی روشنی میں بڑھا رہے ہیں
انھیں دھڑکتے ہُوئے دِلوں کا پیام پہنچے

جو آج زندہ نہیں ہیں
اُن کی روایتوں کے خیال سے سربلند ہیں ہم
وہ ظلم کو ظلم، جبر کو جبر و قہر کہتے ہُوئے لڑے تھے
وہ زندگی کی صعوبتوں کا عذاب سہتے ہُوئے لڑے تھے
شکستہ خوابوں کے اشک انگیز خواب سہتے ہُوئے لڑے تھے
وہ اپنے حق کے لئے لڑے تھے

انہوں نے اپنے نشانِ محنت کی سربلندی کی داد چاہی
وہ خود تھے انصاف کی گواہی
انہی کے خوں سے
تمام دنیا کی عظمتوں سے عظیم محنت کشوں کی عظمت
مثالِ خورشید بڑھ رہی ہے



مغربی پاکستان کے استحصالی طبقے نے عوامی لیگ کی ہمت افزائی کی

قمر رضا جعفری

بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کا اقتدار ایک تازہ طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عوامی لیگ کی طالع آزما قیادت پاکستان کے استحصالی گروہ سرمایہ دار، جاگیردار اور فوجی آمریت کی آغوش تربیت میں پرورش پاکر اس مقام پر پہنچی ہے۔ یہ کسی طور بھی بنگلہ دیش کی اکثریت یعنی کسان اور دوسرے محنت کش طبقوں کے صدیوں پرانے اقتصادی و معاشی مسائل حل کرنے کی اہل نہیں۔ بقول ایک بنگالی سیاستدان "عوامی لیگ ایک ایسی بس ہے جس میں ہر منزل کا مسافر سوار ہے۔" وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیگ کی بنگلہ دیش میں وقتی کامیابی، وہاں کی اکثریت کی عوامی یا طبقاتی جد و جہد کا نتیجہ نہیں، بلکہ عوامی لیگ کی قیادت اس کی عیارانہ سودے بازی کا نتیجہ ہے۔ جو کہ یہ وقتاً فوقتاً امریکی، بھارتی اور پاکستان کے استحصالی گروہ سے کرتی رہی ہے۔ چنانچہ بنگلہ دیش کی وہ عوامی تحریکیں، جو کہ عوامی لیگ کے پھیلائے ہوئے صوبائی عصبیت کے زہر کے سبب افتراق، انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو گئی تھیں اب دوبارہ عوامی لیگ کے سودے بازوں پر ضرب کاری لگانے کے لئے اپنی منتشر عوامی قوتوں کو مجتمع کر رہی ہیں۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش میں عوامی تحریکیں کسی وقت بھی صدیوں پرانی طبقاتی کش مکش کے آتش فشاں کے پھٹنے کا موجب بن سکتی ہیں۔ چنانچہ بنگلہ دیش میں اس طبقاتی کش مکش کے بنیادی عوامل و محرکات سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بنگال کے ان طبقات کی جد و جہد کا نہ صرف دور بدور کی تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے بلکہ ان طبقات کے وہاں کے استحصالی گروہ سے مختلف ادوار میں بدلتے ہوئے معاشی رشتوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔

ہندوؤں میں ایک مثالی حکومت کا تصور رام راج کی صورت میں ملتا ہے۔ جس میں ہندو معاشرہ چار ذاتوں یعنی برہمن۔ چھتری۔ ویش اور شودر میں منقسم تھا۔ چنانچہ برہمنوں کا کام مذہب کی خدمت، چھتریوں کا کام حکومت کی حفاظت ویش کا کام تجارت اور شودر کا کام اپنی ذاتی منفعت سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ ذاتوں کے لئے آرام و آسائش، معاشی فراغت فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ کوئی ذات دوسری ذات کے کام کو نہ تو اختیار کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کام میں دخل دے سکتی تھی۔ ہندو معاشرے میں کسانوں اور محنت کش عوام کا کام صرف اعلیٰ ذاتوں کی منفعت کے لئے کام کرنا تھا۔ ہندو دور میں اسی ظالمانہ استحصالی نظام کے خلاف اکثر بغاوتیں ہوئیں جن میں سیرا بادشاہوں کے دور میں بھیم اور دیپک کی سرکردگی میں کسانوں مچھیروں اور کشتی رانوں کی بغاوت جس کو کیا تاؤں کی بغاوت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندو دور کا مشہور واقعہ ہے۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد حاکموں اور محنت کش عوام کے اقتصادی رشتوں میں انقلاب آگیا۔ چونکہ زمین کے معاملے میں اسلامی تصور ملکیت کے بجائے امانت کا ہے اس لئے کاشت کار بنیادی طور پر زمین سے منفعت حاصل کرنے کا حق دار ٹھہرتا ہے اور اس طرح کاشت کار کا ظل اللہ (خدا کا سایہ) یعنی حاکم وقت سے براہ راست رشتہ قائم ہو جاتا ہے اسلام کے اس تصور امانت نے کسان کو اس قطعہ زمین کے تقریباً حقوق ملکیت عطا کر دیئے جس کی کہ وہ خود کاشت کر رہا تھا۔ مسلم دور میں زمیندار کی حیثیت ایک خاص کمیشن کے عوض کسانوں اور کاشت کاروں سے سرکاری واجبات وصول کرنے والے نیم سرکاری افسر کی سی تھی۔ واجبات پر کمیشن کے عوض زمیندار کا فرض ہوتا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے کسانوں کو کاشت کے دوران ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائے۔ چنانچہ آبیانے کے عوض سرکاری نہروں سے پانی بہم پہنچانا، بنجر زمینوں کو آباد کرنا۔ قحط کی صورت میں تقاوی فراہم کرنا، بیج فراہم کرنا اور سرکاری نہروں، کنوؤں اور جنگلات کی حفاظت کرنا زمیندار کے فرائض میں شامل تھا۔ اکثر اوقات خالصہ یا سرکاری اور اوقاف کی زمینوں سے بھی لگان وصول کرنے کا حق زمینداری کے زمرے میں آتا تھا۔ چنانچہ حاکم وقت سے اسی براہ راست رشتے کے سبب ہندوستان کے کسان عموماً اور بنگال کے کسان خصوصاً بے حد خوش حال تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ فاضل اوقات میں کسان گھریلو صنعتوں اور دستکاری میں بھی حصہ لیتا تھا۔ چنانچہ مسلم دور میں کسانوں اور صناعوں کی خوش حالی کسان کے حاکم وقت سے براہ راست رشتے کی مرہون منت تھی۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور ڈاکٹر ہملن کے ذریعہ چنگی کی معافی بنگال کے کسانوں اور صناعوں کی خوش حالی کیلئے زہر ہلاہل ثابت ہوئی۔ کیونکہ اب کمپنی کی طرف سے جاری کردہ چنگی کی معافی کے پروانے سر بازار فروخت ہونے لگے اور بنگال کی تمام اشیائے تجارت ان پروانوں کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر محصول ادا کئے منتقل ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کا ہر تاجر چنگی بچانے کے لئے ان پروانوں کا خریدار بن گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ کمپنی کے مال پر چنگی معاف ہو جانے کے سبب بنگال کے ہر تاجر کو کمپنی کا گماشتہ یا دلال بن جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کا تمام سامان تجارت کمپنی کے مقررہ کردہ نرخوں پر فروخت ہونے کے سبب کمپنی کی اجارہ داری کے زمرے میں آگیا۔ چنانچہ ایک طرف تو بنگال میں اشیائے تجارت کے نرخ تیزی سے گرنے لگے اور دوسری طرف مقامی نوابوں نے چنگی کی آمدنی کی کمی کو دیگر محاصل عائد کر کے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اشیائے تجارت کے نرخوں میں کمی اور ٹیکسوں میں زیادتی نے بنگال کے معاشی نظام کے توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل بادشاہ شاہ عالم سے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ ادائیگی کے عوض بنگال بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے حقوق بھی حاصل کر کے ان کو محمد رضا خان اور راجہ شتاب رائے کو ٹھیکے پر دیدیا۔ مالیانے

عوامی لیگ کی بس میں ہر منزل کے مسافر سوار ہیں

اور محاصل سے کمپنی کو تقریباً ڈھائی کروڑ روپے سالانہ وصول ہوتے تھے۔ جس میں سے صرف ۳۲ لاکھ روپے سالانہ نواب بنگال کے ذاتی مصارف اور بنگال، بہار اور اڑیسہ کی انتظامیہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ نواب بنگال کے ذاتی اخراجات اور انتظامیہ کے اخراجات کی کسی صورت بھی کفیل نہ ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتظامیہ میں رشوت ستانی کے رجحان نے بنگال کے عوام پر اور بھی بُرا اثر ڈالا۔

لارڈ کارنوالس کے دور میں بنگال کے زمینداروں اور براہِ راست ٹیکس ادا کرنے والے کسانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ صرف ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اپنی زمینوں کے حقوقِ ملکیت فراہم کر دیں۔ چونکہ زمینوں کی ملکیت کے فرامین مرہٹوں کی لوٹ مار کی نذر ہو چکے تھے۔ اِس لئے بیشتر زمینداروں اور کسانوں کو جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اپنی زمینوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ زمین ضبط کرنے کے بعد ان کو سب سے زیادہ لگان ادا کرنے کی بولی دینے والوں کے ہاتھ نیلام کر دیا۔ ظاہر ہے کہ لگان کی بولی لگانے والے وہی ہندو بنئے تھے جنہوں نے کمپنی کے دلّال اور گماشتوں کی حیثیت سے عوام کو لوٹ کر بے تحاشا دولت کمائی تھی اور جو کہ زمین حاصل کرنے کے بعد جوتے دار گرانٹ دار اور تعلقدار کے ناموں سے موسوم تھے۔ کارنوالس کے اسی طریقہ کار سے کمپنی اور اس کے دلالوں کی آمدنی میں تو بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ مگر کسان کی معاشی حالت اس قدر تباہ ہو گئی کہ وہ زمین چھوڑ چھوڑ کر جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

بنگال کے مسلمان کسانوں اور محنت کشوں کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ہندو دلالوں اور گماشتوں کے استحصالی گٹھ جوڑ کی انسانیت سوز اور شرمناک حرکتوں نے بنگال کو پلاسی کی لڑائی کے صرف چودہ سال بعد تاریخ کے سب سے بڑے قحط سے دوچار کر دیا۔ جس میں بنگال کی تقریباً ایک تہائی آبادی بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ ۱۷۹۰ء - ۱۷۹۴ء کے دور میں بنگال ایک بار پھر قحط کا شکار ہوا اور اس کے بعد یہ قحط بنگال کی زندگی کا معمول بن گئے۔ جوں جوں بنگال کے کسان قحط اور فاقوں کا شکار ہوتے گئے اتنا ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کاشت کاروں کے خلاف استحصالی قوانین میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۸۱۲ء - ۱۸۴۵ء، ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء کے قوانین نے کاشت کاروں کے استحصال کی مزید اجازت دے دی۔ جن کے تحت کاشت کاروں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے کھیتوں پر غلے کے بجائے برطانوی صنعتوں کی ضرورت کا خام مال مثلاً نیل اور جوٹ کی کاشت پر اکتفا کریں کمپنی کی اس استحصالی حکمتِ عملی کے خلاف بنگال کے کسانوں نے بغاوتیں کیں۔ چنانچہ ۱۷۹۰ء ۱۸۱۰ء کا دور بنگال میں کسانوں کی بغاوتوں کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا واضحات ثابت کر دیتے ہیں کہ انگریزوں کی بنگال میں آمد کے بعد وہاں کی آبادی واضح طور پر دو منفرد طبقات میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اوّل وہ طبقہ استحصالی گروہ تھا جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلالی سے ابتدا کر کے زمیندار تاجر، سود خور اور آخر کار کارخانے دار بن گیا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے گماشتوں کی استحصالی کارروائیوں کے سبب خوش حال کسان اور زمیندار کی حیثیت کھو کر مزارع، کاشت کار اور صنعتی مزدور کے قلاش اور فاقہ کش گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ بد قسمتی سے بنگال کا استحصالی طبقہ ہندو فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب کہ استحصال شدہ طبقے کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ فطرتاً بنگال کے کسانوں اور مزدوروں کی استحصالیوں کے خلاف بغاوتوں نے دونوں جانب سے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کی اس شرمناک استحصال کے خلاف بغاوتوں نے استحصالی گروہ یعنی انگریزوں اور ہندوؤں میں مذہبی جنون اور دیوانگی کو فروغ دیا۔ چنانچہ بنگال کے کسانوں اور محنت کشوں کی استحصال سے نجات پانے کی ہر کوشش کو اسلام کی بنیادی رجعت پسندی اور جدید رجحانات کو قبول کرنے کی صلاحیت کے فقدان سے تعبیر کیا گیا۔

مسلم لیگ کی نااہل

قیادت نے بنگالی عوام

کو مایوس کر دیا

انگریزوں اور ہندوؤں کی معاشی خوش حالی نے ان طبقات میں اپنے مذاہب کی نشاۃ ثانیہ کا جذبہ جنون کی حد تک ہو بخا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۰۰ء کے بعد جب کہ مسلمان فاقہ کشی سے تنگ آ کر بغاوتیں کر رہے تھے۔ ہندوستان میں عیسائی اور ہندو مبلغین کا دور شروع ہو رہا تھا۔ ہندو اور عیسائی مبلغین اور مصلحین کا اوّلین مقصد برطانوی حکومت سے وفاداری کے نظریات کی ترویج و اشاعت تھی کیونکہ اُن کے خیال میں برطانوی حکومت جدید نظریات اور ترقی پسندی کا سرچشمہ تھی اور چونکہ مسلمان ایک فرسودہ نظام کے نمائندے ہونے کے سبب ان جدید نظریات کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ جن کے تحت انگریزوں اور ہندوؤں نے ان کا معاشی استحصال کیا تھا، سب سے بڑے دشمن تھے اسی لئے عیسائی اور ہندو مبلغین کا یہ فرض ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کے استحصال کو ترقی پسندی اور اس استحصال کے خلاف بغاوت کو جہالت اور مسلمانوں کی فاقوں اور قحط سے اموات کو ایک فرسودہ نظام کے داعیوں کا منطقی خاتمہ قرار دیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے لوٹی ہوئی دولت کو ہندو اور عیسائی مبلغین کھلم کھلا اپنے مذاہب کی ترویج و اشاعت پہ خرچ کر رہے تھے۔ جب کہ بنگال کے گلی کوچے مسلمان محنت کشوں اور کسانوں کی فاقہ زدہ نیم عریاں لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنانچہ اس دور کے ہندو مصلحین و مبلغین میں راجہ رام موہن رائے۔ ڈبند ناتھ ٹیگور، ایشور چندر ودیا ساگر اور عیسائیوں میں دیورینڈ لال بہاری ڈے، دیورینڈ اناڈے اور پنڈتا راما بائی مشہور ہیں۔

ہندو اور عیسائی طبقے کا یہ استحصالی گٹھ جوڑ اولاً او کھلے کی ہندوستان کے فدویوں کی جماعت اور بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانگریس جس کی بنیاد ایک انگریز ہیوم نامی نے برطانوی حکمت عملی کی تائید و حمایت کرنے کے لئے ڈالی تھی۔ رفتہ رفتہ ان ہندو دلالوں اور گماشتوں کا اکھاڑہ بن گئی جو کہ اب صنعت کار بن چکے تھے اور جن کے لئے اب برطانوی مصنوعات کے مقابلے میں اپنی مصنوعات کی فروخت سب سے بڑا مسئلہ تھی، چنانچہ ان سرمایہ داروں نے اپنی مالی اعانت کے عوض کانگریس کو بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی مال کی سرپرستی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ کانگریس نے بنگال میں اپنی تحریک کو بنگال کے استحصالی طبقے یعنی یعنی جوتے داروں، گرانٹ داروں، تعلقداروں اور مہاجنوں کے ذریعے منتقل کیا تا کہ





نیشنل عوامی پارٹی کے قیام سے

عوامی لیگ کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا

اسی طبقے کی دولت اور مقامی اثرات کو اپنے مفاد میں استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ بنگال کی کانگریس تحریک دراصل بنگال کے استحصالی طبقے کی نمائندہ تھی۔ جو کہ اب آزادی کے دلفریب نعروں کی آڑ میں مزید استحصال کا ہتھیار بن گئی۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کانگریس نے بنگال میں مسلم اکثریت کے پیش نظر اپنی تحریک کو عوامی سطح پر منظم کرنے کے بجائے صرف حقوق یافتہ طبقے کی تائید و نصرت کو کافی سمجھا۔

پیش نظر حالات میں واضح ہو جاتا ہے کہ بنگال کے مسلمانوں یعنی کسانوں اور محنت کشوں کی نہ ہی کوئی تنظیم تھی اور نہ ہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والا کوئی ادارہ۔ بنگال کے کسانوں اور محنت کشوں کا یہ طبقہ ایک عجیب کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہا تھا۔ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ جوتے داروں، گرانٹ داروں اور تعلقداروں کی نذر ہو جاتا تھا اور اگر وہ قحط اور فاقوں سے بچنے کے لئے صنعتی اداروں کا رُخ کرتے تھے تو وہاں ان کے ساتھ وہی امتیاز برتا جاتا تھا جو کہ یورپ کے صنعتی اداروں میں ایشیا اور افریقہ کے افراد کے ساتھ اور امریکہ میں حبشی اور چینی مزدوروں کے ساتھ برتا جاتا ہے۔

ان حالات میں بنگال کے ہندو زمیندار اور سرمایہ دار نے بنگال کے عوام پر اپنی استحصالی گرفت قائم رکھنے کے لئے اور اپنی استحصالی کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بنگالی قوم پرستی کا نعرہ بلند کیا۔ جس کے تحت بنگلہ تہذیب و ثقافت اور بنگلہ زبان کو ایک جداگانہ صورت دینے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اگر بنگلہ قوم پرستی کی تحریک کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا محرک وہی ہندو طبقہ نظر آتا ہے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالیوں سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف معاشی لوٹ کھسوٹ کا جال بچھایا تھا۔ چنانچہ بنگلہ قوم پرستی کی تحریک میں دمیندر ناتھ ٹیگور، کیشب، چندر سین، بنکم چیٹر جی اور رابندر ناتھ ٹیگور کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ بنکم چیٹر جی نے اپنے ناولوں میں ہندوؤں کی مسلمانوں پر برتری ثابت کرنے کی کوشش کی جب کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے "آمار سونار بنگلہ" کا قومی نغمہ تخلیق کیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ بنگال کے ہندوؤں نے تو مذہبی اور سیاسی تحریکوں کے ذریعے اپنا رابطہ ہندوستان کے دوسرے علاقے کے ہندوؤں سے قائم رکھا لیکن مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ صرف بنگالی قومیت پر اکتفا کریں۔

۱۹۴۷ء میں محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کی تحریک کا احیاء ہوا اور بنگال کے مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لئے جوق در جوق شامل ہونا شروع ہو گئے۔ مولانا شریعت اللہ اور تیتو میر کی تحریکوں کو عوامی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ کا یہ ایک حتمی فیصلہ ہے کہ دنیا کی ہر عوامی تحریک کو عصبیت کے نعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے وہ محنت کش عوام، جو ہندوؤں کے صنعتی اداروں میں بھی فرقہ وارانہ امتیاز کے شکار تھے، مسلم لیگ کی عوامی تحریک میں ایک نظریے، ایک نعرے اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

مسلم لیگ کی تحریک کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آ گیا اور بنگال کا ایک حصہ منقسم ہو کر مشرقی پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہو گیا۔ مگر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلم لیگ میں حقوق یافتہ طبقے مثلاً نوابوں اور جاگیرداروں نے پسِ پردہ محلاتی سازشوں کے ذریعے مسلم لیگ کی قیادت کی اجارہ داری حاصل کر کے اس عوامی تحریک کو پلاسی کی لڑائی کے ماقبل دور میں دھکیل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کی اجارہ دار قیادت نے مسلم لیگ کے عوامی رہنماؤں کو مسلم لیگ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا اور اس طرح مسلم لیگی

کسی وقت "بنگلہ دیش" میں
عوامی تحریکیں
آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گی

قیادت نے اسلام کے کھوکھلے نعروں کی وقتی شعبدہ گری سے کام لیا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے عوام نے دیکھا کہ ان کے صدیوں پرانے معاشی مسائل حل ہونے کے بجائے پیچیدہ تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مسلم لیگ کی اس نا اہل قیادت کے ردِ عمل کے طور پر بنگلہ دیش کے عوام کو یقین ہو گیا کہ صرف اسلامی اتحاد اور اخوت کے نعرے ان کے صدیوں پرانے معاشی مسائل کا حل ثابت نہیں ہو سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دیکھ رہے کہ بنگال کی بیشتر صنعتی اجارہ داریاں اسلامی مساوات کے نام پر غیر بنگالیوں کے ہاتھ میں جا چکی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ملازمتوں تک کے دروازے کسی نہ کسی بہانے ان کے اوپر بند ہیں۔ ان حالات میں بنگال کے عوام کا اسلامی نعروں سے بدظن ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ سے بغاوت مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن میں کرشک سرامک پارٹی اور عوامی لیگ پیش پیش تھیں۔ مشرقی پاکستان میں کرشک سرامک پارٹی کسانوں کی نمائندہ جماعت تھی جبکہ عوامی لیگ بنیادی طور پر بنگال کے مختلف طبقات کی نمائندگی کے لئے قائم ہوئی تھی اور جس میں اس کے ابتدائی ایام میں محنت کش طبقے کی نمائندگی کے سبب اور ان کے دوسرے رفقاء مثلاً طہٰ۔ عبد الحق، تیلین اور علاؤالدین وغیرہ شامل تھے گو عوامی لیگ حسین شہید سہروردی کی قیادت میں مسلم لیگ کے طرز پر پورے پاکستان کی نمائندگی کی دعوے دار تھی۔ مگر بنیادی طور پر یہ جماعت صرف مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہشات کی ترجمان تھی۔ اس جماعت کا مطمع نظر مغربی پاکستان کے رہنماؤں سے سودے بازی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنا تھا۔ اس لئے یہ مشرقی پاکستان میں کسی خاص طبقے کی نمائندگی کرنے کے بجائے مسلم لیگ کی طرح ہر طبقہ خیال کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہو گئی۔ عوامی لیگ میں مختلف طبقات کی کشمکش نے رفتہ رفتہ اس پارٹی کے مزاج میں سودے بازی کا زہر گھول دیا۔ اور اس سودے بازی کے مرض نے عوامی لیگ کو بجائے کسانوں اور محنت کشوں کی طبقاتی جد و جہد کا محور بنانے کے اس کو مشرقی پاکستان کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور طالع آزماؤں کا اکھاڑہ بنا دیا۔ جن کا بنیادی مقصد مشرقی پاکستان کے کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کو نظر انداز کر کے وہاں کی اقتصادی و معاشی اجارہ داری حاصل کرنا تھا۔ عوامی لیگ کی ابن الوقت اور طالع آزما قیادت نے مشرقی پاکستان کے

مولویوں نے استحصال سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کو اسلام کے منافی قرار دے دیا

کسانوں اور محنت کشوں میں طبقاتی شعور پیدا کر کے استحصالی طریقہ کار کی مخالفت کے بجائے مغربی پاکستان کے ہر طبقے کے خلاف نفرت کو ہوا دی۔

عوامی لیگ کی عصبیت کے نعروں پر پرورش پانے والی ابن الوقت اور سودے باز قیادت کے خلاف کسانوں اور مزدوروں کے طبقات نے مولانا بھاشانی کی قیادت میں بغاوت کر کے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ نیشنل عوامی پارٹی جس میں کچھ عرصے بعد مغربی اور مشرقی پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیاں بھی ضم ہو گئیں۔ پاکستان کے محنت کش عوام کی نمائندگی کی دعوے دار بھی اور اس کا نصب العین استحصالی نظام کے خلاف جدوجہد تھا۔ چنانچہ مولانا بھاشانی جنہوں نے مشرقی پاکستان کے محنت کش عوام کو اپنے پیش رو یعنی مولانا شریعت اللہ اور تیتومیر کے طرز پر منظم کرنے کی سعی و کوشش کی تھی۔ اس پارٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

نیشنل عوامی پارٹی کی تشکیل، اس کے عوامی مزاج اور عوامی سطح پر جدوجہد کے سبب عوامی لیگ کی طالع آزما قیادت کو اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آیا۔ چنانچہ عوامی لیگ نے نیشنل عوامی پارٹی کے مقابلے میں اپنی سیاسی کشش قائم رکھنے کے لئے ایک طرف تو صوبائی عصبیت کے نعروں کو ہوا دی اور دوسری طرف مغربی پاکستان کے استحصالی طبقے سے گٹھ جوڑ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عوامی لیگ کے سرمایہ داروں نے مغربی پاکستان سے نفرت کے نعروں کے باوجود مغربی پاکستان کے استحصالی طبقے سے تاجرانہ شراکتیں کیں۔

بدقسمتی سے نیشنل عوامی پارٹی تھوڑے ہی عرصے کے بعد اندرونی طور پر نظریاتی اختلافات کا شکار ہو گئی۔ جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس پارٹی نے طبقاتی جدوجہد کے بجائے جمہوریت کی بحالی اور عوام کی بنیادی آزادی پر زیادہ زور دیا۔ نتیجے کے طور پر یہ پارٹی صوبائی حقوق کی جدوجہد کا مرکز بن گئی۔ اس کے علاوہ اس پارٹی میں شامل ہونے والے اکثر رہنما جو کہ حکومت وقت سے اختلاف یا مصلحتِ وقت کے تحت شامل ہوئے تھے، حقوق یافتہ طبقے سے متعلق ہونے کے سبب بنیادی طور پر رجعت پسند تھے۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی میں اس طبقے کی شمولیت انڈین نیشنل کانگریس میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی شمولیت کے مترادف تھی۔ کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی کا یہ طبقہ بھی عوامی نعروں کے طفیل بنیادی طور پر اقتدار کا متمنی تھا۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی کے اسٹیج پر عوامی نعرے اور اپنے علاقوں میں صوبائی حقوق کی آڑ میں عصبیت کے نعرے ان سیاسی مریضوں کی دوسری حکمت عملی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی کی نیشنل عوامی پارٹی کی ورکنگ کمیٹی میں شمولیت پر اس طبقے کا اعتراض اس طبقے کے اصلی چہرے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں گو بظاہر نیشنل عوامی پارٹی متحد رہی لیکن اس کے اندر مختلف نظریات رکھنے والے گروہوں کی کش مکش اور اختلافات نے اس عوامی پارٹی کے عوامی رابطے کی تحریک پر بُرا اثر ڈالا۔ کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی کی طبقاتی جدوجہد کی تحریک ان متضاد اور متصادم خیالات کے سبب نظریاتی الجھاؤ اور تلوّن کا شکار ہو گئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کا ایک طبقہ جس کی قیادت طٰہ اور عبدالحق کر رہے تھے۔ صنعتی مزدوروں کی تنظیم اور جدوجہد پر زور دیتا تھا۔ جب کہ دین، سکدار، متین اور علاؤالدین کا گروہ صنعتی مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد کی تحریک پر زور دے رہا تھا۔ ان دونوں گروہوں کے علاوہ ظفر، مینن گروہ کسان مزدور اتحاد کا مؤید ہونے کے باوجود متین علاؤالدین گروہ سے طریق کار کی نوعیت پر اختلافی نظریات رکھتا تھا۔

نیشنل عوامی پارٹی کے اندرونی اختلافات کے سبب عوامی لیگ کو موقع مل گیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں صوبائی عصبیت کا جادو جگا کر اقتدار حاصل کرے۔ مغربی پاکستان کی حکومت

استحصال پر پردہ ڈالنے

کے لئے بنگالی قوم پرستی کا

نعرہ بلند کیا گیا

استحصالی طبقے اور اجارہ دار پریس نے بھی، جو کہ نیشنل عوامی پارٹی کے نظریات سے خائف تھا۔ مجیب کی قدم قدم پر ہمت افزائی کی۔ چنانچہ عوامی لیگ کو چھ نکات کی بنیاد پر الیکشن لڑنے کی اجازت اور پھر عوامی لیگ کے الیکشن جیتنے کے بعد مجیب سے سودے بازی کی کوششیں اس استحصالی گروہ کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

الیکشن میں عصبیت کے نعروں کے ذریعے مکمل کامیابی حاصل کر لینے کے بعد عوامی لیگ کی سودے باز قیادت کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ نہ صرف مشرقی پاکستان کے لئے ہی بلکہ مغربی پاکستان کے لئے بھی اپنے منشور پر عمل درآمد کروا سکتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ان عوامی تحریکوں کے خوف سے جو کہ وقتی طور پر نیشنل عوامی پارٹی کے اندرونی انتشار اور عصبیت کے نعروں کے سبب ـــــ دب گئی تھیں۔ عوامی لیگی قیادت جلد از جلد اس سودے بازی کی تکمیل کے لئے کوشاں تھی۔ خواہ یہ سودے بازی پاکستان کے استحصالی گروہ سے ہو یا بھارت کے استحصالی گروہ سے۔

مغربی پاکستان کے استحصالیوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب انہوں نے دیکھا کہ عوامی لیگی قیادت، ان کے ساتھ سودے بازی کے ساتھ ساتھ بھارت کے استحصالیوں سے بھی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ لیکن اس دور کی حکومت نے اپنی سیاسی ناتجربہ کاری کی بناء پر ایک فاش غلطی کی اور وہ یہ تھی کہ وہ عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے نظریات میں بنیادی اختلافات کو نہ سمجھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی حکومت مشرقی پاکستان کے ایک بہت بڑے طبقے کی حمایت سے محروم ہو گئی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ فوجی حکومت نے مجیب اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان لوگوں کو مشرقی پاکستان کے عوام کی نظروں میں شہیدوں کا مرتبہ دے دیا۔ رہی سہی کسر بے جا جبر و سختی نے پوری کر دی۔ چنانچہ ان گرفتاریوں اور فوجی سختیوں نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے مخالفین کو بھی یقین دلا دیا کہ مغربی پاکستان کے لوگ ہر قیمت پر مشرقی پاکستان کا استحصال جاری رکھنا چاہتے ہیں اور مشرقی پاکستان کے عوام کا یہی جذبہ بنگلہ قوم پرستی کے احیاء کا ضامن بن گیا۔

اس تجزیے سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنگلہ قوم پرستی کے جادو کو جگانے میں صرف عوامی لیگ کی طالع آزما قیادت کا ہی ہاتھ نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے استحصالیوں اور اجارہ دار پریس کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے۔ لیکن عوامی لیگ کا بھارت کے استحصالیوں سے اتحاد بھی وہاں کے عوام کے معاشی مسائل کا حل نہیں کیونکہ بھارت کے توسیع پسندوں نے مشرقی پاکستان کے معاملات میں وہاں کے عوام کے بنیادی معاشی مسائل حل کرنے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنے سرمایہ دارانہ عزائم کے تحت دخل دیا ہے۔ نتیجۃً وہاں عوامی تحریکوں اور طبقاتی جدوجہد کی رفتار تیز تر ہو رہی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ طبقاتی جدوجہد ایک خانہ جنگی کی صورت اختیار کر کے مغربی بنگال کو بھی بھارتی گرفت سے آزاد کروانے کا سبب بن جائے۔

فضائیہ کے ایک اعلیٰ افسر کا محکمہ موسمیات پر سبوتاژ کا سنگین الزام

محکمہ موسمیات پردہ چاک

پاک بھارت جنگ کے دوران

محکمہ موسمیات کے راڈار پُراسرار طریقے سے خراب ہو گئے

الفتح رپورٹ

کچھ روز پہلے قومی اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی کہ محکمہ موسمیات کے سب راڈار عرصہ دراز سے خراب ہیں اور کام نہیں کر رہے۔ دوسری تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہو گا کہ ان راڈاروں کے خراب ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ان راڈاروں سے بالائی فضا کی جو اطلاعات ملتی ہیں۔ ان سے ہوائی جہازوں کی پرواز (فوجی اور غیر فوجی دونوں) میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے میدانی توپخانہ (ARTILLERY) اور ہوائی جہاز گرانے والی توپوں (ANTI AIRCRAFT GUN) کی کامیابی کا دارومدار بہت حد تک ان اطلاعات پر ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ حالیہ جنگ شروع ہونے سے پہلے کراچی، سرگودھا اور جیکب آباد کے (WIND FINDING RADAR) اور جرات میں نصب WEATHER SURVEILLIANCE RADAR مکمل خراب ہو چکے تھے۔ جب کہ کراچی کا (WEATHER SURVEILLIANCE RADAR) جزوی طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ ایک کے بعد دوسرا راڈار خراب ہوتا رہا اور ان کی مرمت پر کوئی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران بھی خراب رہے اور اب بھی خراب ہیں۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں بھی کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہوئے تھے۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں قیامت خیز طوفان سے قبل ڈھاکہ اور کاکس بازار کے طوفان کی نشان دہی کرنے والے راڈار اچانک خراب ہو گئے تھے۔ جس پر قومی اخبارات میں کافی لے دے ہوئی تھی۔

مندرجہ بالا واقعات اور ان کے درمیان ہونیوالے واقعات سے بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ماہرین موسمیات کے مطابق اکتوبر اور نومبر کے مہینے ایسے ہیں۔ جن میں عام طور پر خلیج بنگال کے علاقے میں طوفان آتے ہیں۔ کیا قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا وقت ان حالات کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا تھا؟ کیا اس کا مقصد یہ نہیں تھا۔ کہ طوفان سے حالات درہم برہم ہو جائیں اور الیکشن کھٹائی میں پڑ جائے۔

(۲) کیا ڈھاکہ اور کاکس بازار کے راڈار طوفان سے قبل واقعی اچانک خراب ہوئے تھے؟ یا اس کے پیچھے خفیہ ہاتھ کارفرما تھے۔؟

(۳) ہندوستان سے حالیہ جنگ شروع ہونے سے کافی عرصہ قبل صرف مغربی پاکستان کے موسمیاتی راڈار یکے بعد دیگرے کیسے خراب ہو گئے تھے اور جنگ کے دوران بھی خراب رہے۔؟

(۴) جنگ کے دوران ان راڈاروں کی اہمیت کے باوجود کن عناصر کے اشارے پر ان کی مرمت پر توجہ نہیں دی گئی۔

(۵) کیا ان راڈاروں سے اطلاع نہ ملنے پر ہمارے فوجی ہوائی جہازوں کو جنگ کے دوران پرواز میں دقت پیدا نہیں ہوئی۔؟

(۶) کیا ان راڈاروں سے اطلاع نہ ملنے پر ہمارا توپ خانہ مؤثر کام کر سکا ہو گا۔؟

(۷) کہیں ایسا تو نہیں کہ ان راڈاروں سے ملنے والی اطلاع کی غیر موجودگی میں ہماری طیارہ شکن توپیں دشمن کے ہوائی جہازوں کے خلاف مؤثر کارروائی نہ کر سکیں۔؟

(۸) کیا یہ محض اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان اور نومبر، دسمبر ۱۹۷۱ء میں صرف مغربی پاکستان میں موسمیاتی راڈار اس وقت خراب ہو گئے جبکہ وطن عزیز مشکل میں تھا؟ کیا دونوں موقعوں پر یعنی ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں راڈاروں کے خراب ہونے کی کوئی تحقیقات کرائی گئی؟ اگر نہیں تو کس کے اشارے پر۔؟

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نومبر ۱۹۷۰ء کے طوفان کے بعد ہونے والی تباہی کو علیحدگی پسند عناصر نے اپنے مفادات کے لئے خوب استعمال کیا۔ ایک خبر کے مطابق طوفان سے متاثرین کی خوراک اور دواؤں کی امداد کی صورت میں اسلحہ آتا رہا جو مارچ ۱۹۷۱ء کے واقعات میں استعمال کیا گیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے شک پیدا ہوتا ہے کہ راڈاروں کا ضرورت کے وقت خراب ہونا کسی سوچے سمجھے منصوبے اور سازش کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل واقعات کو اس سے ملایا جائے تو اس خیال کو اور تقویت ملتی ہے۔

(۱) چند سال پیشتر ہوائی فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے تحریراً محکمہ موسمیات پر عدم تعاون اور سبوتاژ کے سنگین الزام لگائے تھے۔

(۲) محکمہ موسمیات کے ڈائریکٹر ۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء سے ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء تک بین الاقوامی موسمیاتی ادارے کی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے جنیوا میں تھے۔ وہاں پر انہوں نے ہندوستان کے نمائندے سے متعدد بار اور اسرائیلی نمائندہ سے ملاقات کی۔ ہندوستان کی پاکستان دشمنی اور بنگلہ دیش کی مسلسل حمایت کے باوجود اس کے نمائندہ نے کیوں ہمارے نمائندہ کو بین الاقوامی موسمیاتی تنظیم کے الیکشن میں کامیاب کرانے کے لئے پُرزور کوششیں کیں۔؟

(۳) کیا وجہ ہے کہ ہمارے محکمہ موسمیات نے ہمیشہ سے علاقائی موسمیاتی اطلاعات کے حصول کے لئے نئی دہلی پر انحصار کیا۔؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہندوستان نے تمام موسمیاتی اطلاعات بہم پہنچانا بند کر دی تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد بھی ہندوستان پر انحصار کیوں ختم نہیں کیا گیا۔؟

(۴) ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان شہریوں کی آمد و رفت پر کافی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ خصوصاً پولیس اور فوج کے ارکان اور ملک کے دفاع کے متعلق افراد پر، وزارت دفاع کے ایک ذمے دار کارکن مسٹر علیم الدین سیکشن آفیسر اپریل، اور مئی ۱۹۷۱ء میں نجی کام سے ہندوستان گئے اور ایسے وقت میں جب کہ مشرقی پاکستان میں مارچ ۱۹۷۱ء کے واقعات کے بعد کافی تناؤ تھا اور ہندوستان کا بنگلہ دیش پراپیگنڈہ پورے عروج پر تھا۔ کیا ان حالات میں ان کا وہاں آنا جانا حفاظتی اقدامات کے خلاف نہیں تھا؟ ان حالات میں انہیں ہندوستان جانے کی اجازت دی گئی۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں انٹیلی جینس والوں نے ان سے پوچھ گچھ کی۔؟

پاکستان پیپلز پارٹی ضلع ملتان کے جنرل سیکرٹری اشفاق احمد خان سے نعیم الحسن کی ایک ملاقات



علیحدگی کی تحریک کو فروغ دینے میں فوجی ٹولہ برابر کا شریک تھا

پاکستان پیپلز پارٹی ملتان کے جنرل سیکرٹری جناب اشفاق احمد خان نے سہ فریقی سمجھوتہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سامراجی، سوشل سامراجی اور بھارتی توسیع پسند قوتیں عرصہ سے اس کوشش میں تھیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں عوامی انقلاب کے بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنے کے لئے عوامی جمہوریہ چین کے گرد گھیرا ڈال سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے سیٹو اور سنٹو جیسے بلاک تشکیل دیئے۔ لیکن عوام کے بڑھتے ہوئے شعور نے ان معاہدوں کو غیر مؤثر بنا دیا۔ نئے منصوبہ کو "ایشیائی سلامتی" کا نام دیا گیا۔ یہ تمام منصوبے اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک جنوب مشرقی ایشیا خاص طور پر برصغیر ہند و پاکستان میں ایسی حکومتیں برسرِ اقتدار نہ آ جائیں جو مکمل طور پر ان قوتوں کی حاشیہ بردار ہوں۔ اسی پس منظر میں مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک اور مغربی پاکستان میں لسانی اور علاقائی عصبیتوں کے فروغ کی سازشیں تیار کی گئیں۔ پاکستان کا فوجی حکمران ٹولہ بھی ان سازشوں میں برابر کا شریک تھا۔ جس کا نتیجہ مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضہ اور مغربی پاکستان میں سیاسی اقتصادی اور معاشرتی بحران ہے —— مشرقی پاکستان پر بھارتی توسیع پسندوں کے قبضے کے باوجود وہ سازش پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ چنانچہ اب سامراجی، سوشل سامراجی اور بھارتی توسیع پسند حکمران ٹولہ یہ چاہتا ہے کہ اگر پاکستان موجودہ حالت میں جغرافیائی طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے بھارت کی ایک طفیلی ریاست کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے بصورتِ دیگر —— وہی عمل دہرایا جائے جو اس سے قبل مشرقی پاکستان میں کیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے عوام، مزدور، کسان، دانش ور، طالب علم اور محبِ وطن طبقات اس صورت میں پاکستان کو بھارت کی ایک باجگزار ریاست بنانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اسی وجہ سے صدر بھٹو کی حکومت نے اس سازش کا مقابلہ کرنے کی کوششوں کا اظہار کیا۔ بیرونی دباؤ کے ساتھ ساتھ تمام سامراج دوست، سوشل سامراج نواز اور رجعت پرست قوتوں نے اندرونِ ملک بھی مختلف خوش نما نعروں کے پس پردہ حکومت پر دباؤ ڈالنے کی پوری پوری کوششیں کر رہی ہیں تاکہ حکومت بھارت کے ساتھ سودے بازی پر مجبور ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے جنگی قیدیوں کی واپسی، جمہوریت کی بحالی اور دیگر مسائل کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

جہاں تک سہ فریقی سمجھوتے کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدر بھٹو نے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ اس سمجھوتے سے سیاسی مسائل کو سیاسی انداز سے طے کرنے کے اصول کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔ دوسری طرف عوام کو بھی یہ اعتماد پیدا ہوا کہ ملک کے سیاسی رہنما —— ملک کو موجودہ غیر یقینی صورت حال سے نکالنے کے لئے کچھ مثبت اقدامات کر رہے ہیں۔ یہ سمجھوتہ عوام کے وسیع تر مفاد میں تھا۔ اور اس سے اس بیرونی سازش کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ وہ قوتیں کمزور ہو گئی تھیں جو پاکستان کو بیرونی سازش کے تحت بھارتی توسیع پسندوں کے رحم و کرم پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سمجھوتے سے پہلے اور بعد میں نیشنل عوامی پارٹی کا یہ کردار کھل کر سامنے آ گیا کہ وہ پاکستان میں سوشل سامراجیوں اور بھارتی توسیع پسندوں کی سیاسی حکمت عملی میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے —— اور اسی لئے جب نیپ کی قیادت کو یہ محسوس ہوا کہ اس سمجھوتے سے ان کی اس سیاست کو دھکا پہنچا ہے۔ تو انہوں نے معاہدے کی تشریح کے نام پر اس معاہدے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ اور نتیجتاً معاہدہ ختم ہو گیا۔

خان قیوم سے سمجھوتہ

بورژوا پارلیمانی سیاست میں اختلاف اور اتحاد وقتی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تابع ہوتا ہے۔ میں خان قیوم کے ساتھ اتحاد کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ جہاں تک خان قیوم کے کردار کا تعلق ہے پاکستان کا ہر باشعور فرد ان کی عوام دشمنی اور موقع پرستی سے اچھی طرح واقف ہے۔

اصغر خان اپنا حصہ ڈال رہے ہیں

حالات و واقعات ریٹائرڈ اصغر خان کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں کہ "صدر بھٹو روس اور بھارت کے ساتھ کوئی خفیہ معاہدہ کر چکے ہیں اور اس کے لئے فضا کو ہموار کیا جا رہا ہے"، بلکہ اصغر خان کے اس بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بھی اس بیرونی سازش کو کامیاب بنانے کے لئے اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔

لسانی تنازعہ

اشفاق احمد خان نے کہا —— لسانی جھگڑا بھی عوام دشمن اور رجعت پسند قوتوں کی پیداوار ہے۔ یہ سب کچھ عوام کے طبقاتی شعور کو کند کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ گزشتہ تین چار سال کے عرصہ میں مختلف علاقوں کے مزدوروں، کسانوں، طلباء اور محنت کش عوام کے مابین جو طبقاتی اتحاد کا شعور بیدار ہوا ہے۔ عوام دشمن قوتیں اس کو مختلف طریقہ سے کمزور کر کے علاقائی اور لسانی جھگڑوں میں الجھانا چاہتی ہیں۔ جہاں تک علاقائی زبانوں اور ثقافت کا تعلق ہے ان کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ اس بات کو قطعاً نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ان معاملات میں عوام کی خواہش اور رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ ان پر مسلط کیا جا سکتا ہے۔

پیپلز پارٹی اور تنظیمی ڈھانچہ

ملک میں موجود تمام تر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ملک کے کسانوں، مزدوروں، طلباء، دانش وروں اور تمام محبِ وطن عوام دوست افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک میں ایک مضبوط، فعال اور انقلابی تحریک منظم کریں۔ جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق ہے اس کی از سرِ نو تنظیم بہت ضروری ہے۔ کیونکہ پاکستان کے عوام نے گزشتہ ۲۵ برس میں بے شمار حکومتی پارٹیاں دیکھی ہیں۔ لیکن وہ اب تک پارٹی کی حکومت سے محروم ہیں۔ اس لئے پیپلز پارٹی کو جمہوری خطوط پر منظم کر کے حکومت کو پارٹی کے تابع بنایا جائے۔ اور اس کے لئے ہر سطح پر فوری اقدامات کئے جائیں ورنہ پارٹی کی تنظیمی کمزوری حکومت کے اقدامات پر اثر انداز ہو گی۔ اور عوام کا یہ تاثر بڑھتا جائے گا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بھی عوام دشمن، استحصالی طبقوں کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو گئی۔

شمالی شینسی کی مہم کے دوران صدر ماؤ کی زندگی کے بارے میں خوشگوار یادیں ——— (۶)

دشمن کے ایک لاکھ سپاہی دو پہلوؤں سے ہماری جانب بڑھ رہے تھے



ین چھانگ لِن۔ ترجمہ احفاظ الرحمٰن

اندھیرے میں سوئیتھ ایک اجاڑ منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر جگہ ٹوٹی ہوئی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں اور دیواریں زمین پر گری ہوئی تھیں۔ شہر کے تمام باشندے وہاں سے جا چکے تھے۔ ہم دو سڑکوں سے گزرے لیکن ہمیں ایک بھی آدمی نظر نہیں آیا۔ مرغیوں اور کتوں تک کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ غار نما مکانات کی کھڑکیاں اور دروازے جلا کر راکھ کر دیئے گئے تھے۔ اور ان میں جا بجا سیاہ سوراخ نظر آ رہے تھے۔ صدر ماؤ اپنے گھوڑے سے اتر گئے، مارچ کرتے ہوئے سپاہی ان کے سامنے سے گزر رہے تھے اور وہ گہری سوچ میں غرق تھے۔ اچانک مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں غصے سے کانپ رہا ہوں۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا جب میں کئی سال پہلے یہاں سے گزرا تھا۔ اس وقت یہ ایک آباد اور پر رونق جگہ تھی۔ سڑکوں کے کنارے بے شمار دکانیں تھیں جن پر پرکشش بورڈ لگے ہوئے تھے انسانوں، خچروں اور گھوڑوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ لیکن آج یہ جگہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جلد یا بدیر ہم دشمن سے اس کی قیمت وصول کریں گے۔

اچانک ہمیں پیچھے سے برتن کھڑکنے کی آواز سنائی دی۔ بوڑھا باورچی کا لنچ بکس اٹھائے ہوئے ہانپتا ہوا چلا آ رہا تھا ——— "جناب صدر!" اس نے پکار کر کہا ——— "آیئے کھانا کھا لیجئے!" اس وقت جب کہ ہم حاضری کے لیے جمع ہوئے تھے اس نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑا سا سوپ اور ڈمپلنگ (ایک معمولی سا کھانا جس میں گوشت یا سبزی کے سوپ میں آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں ڈال کر پکائی جاتی ہیں) تیار کر لیا تھا!

"اب یہ تیار ہو گیا ہے؟" صدر ماؤ نے کہا ——— "تو سب کو بلا لو کہ آ کر تھوڑا تھوڑا کھا لیں!"

ان کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان سے خصوصی سلوک کیا جائے۔ جب کھانا موجود ہوتا تو وہ دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لیتے تھے اور جب کچھ نہیں ہوتا تھا تو وہ ہماری طرح بھوکے رہتے۔ مارچ کے دوران بعض اوقات ایسا ہوا کہ ہم ان کے لیے تربوز خریدنا چاہتے تھے لیکن وہ اس بات پر اصرار کرتے کہ ہم بھی اس میں حصہ بٹائیں۔ بعض اوقات راشن ختم ہو جاتا تو وہ اپنی بھاپ سے بنی ہوئی بچی ہوئی روٹیاں ہم میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ جب ایک شخص کے جوتے بوسیدہ ہو گئے تو انہوں نے اسے اپنے جوتوں کا ایک جوڑا دے دیا۔ جنگ کے دوران جب کہ ہم سگریٹ نہیں خرید سکتے تھے وہ اپنی سگرٹیں ہم میں تقسیم کر دیتے تھے جو انہیں دریائے زرد کے مشرقی علاقے سے بھیجی گئی تھیں۔ اب بھی جبکہ وہاں بہت کم کھانا تھا انہوں نے دوسرے رہنماؤں کو فراموش نہیں کیا تھا۔

ایک بار جب کہ ہم سوئیتھ سے پیچھے تھے اور ہماری فوج شمال کی طرف مڑ رہی تھی تو لیوکان خاک پھانکتے ہوئے ہمارا پیچھا کرنے لگا تھا۔ جب صدر ماؤ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے! اگر دشمن کھائے اور سوئے بغیر گزارہ

تھکن اُتارنے کے لئے صدر ماؤ

گھوڑے سے اُتر کر زور زور سے اچھلنے لگے

کر سکتا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں، مارچ!"
اور ہماری فوج تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

ہم کسی بھی صورت میں

دریائے زرد کو عبور نہیں کریں گے

بظاہر مرکزی کمیٹی کی تنظیمیں بڑے مشکل حالات سے گزر رہی تھیں۔ سامنے دشمن یولن کے جنوب سے آگے بڑھ رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ لیوکان اور اس کے سات بریگیڈ پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ دشمن کے یہ دو کالم جو تقریباً ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ دونوں پہلوؤں سے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ اس بار پھر دشمن کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ہماری مرکزی کمیٹی کی تنظیموں اور مسلح افواج کو دریائے دوتنگ اور دریائے زرد کے درمیان تنگ خطے میں دھکیل دے۔ ہم کسی مشکل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، طے شدہ راستے پر بڑھتے رہے۔ جب ہماری فوج چنگ ارینگ پہنچیں تو ہمارے گھڑ سوار مخبروں نے اطلاع دی کہ لیوکان ہم سے ساٹھ "لی" پیچھے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

"بہت خوب!" صدر ماؤ نے کہا ——— "اگر وہ آرام کر رہے ہیں تو ہم بھی آرام کریں گے!"

بہرحال اس کے بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ دشمن کا شمالی کالم چھن چھوان پاؤ پہنچ گیا ہے جو پیچھی شہر کے شمال میں واقع تھا۔ چنانچہ ہماری فوج نے زیادہ دیر آرام نہیں کیا اور ہم دوبارہ آگے کی طرف مارچ کرنے لگے چونکہ ہم روز بروز زیادہ سے زیادہ تیزی سے مارچ کر رہے تھے اور صدر ماؤ اپنے کھانے اور سونے پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے اس لیے وہ بہت تھک گئے تھے چنانچہ ایک بار اپنے گھوڑے سے اُترے اور زور زور سے اچھلنے لگے ہم سمجھ گئے کہ وہ اپنی تھکن کو دور بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم جلدی سے ایک اسٹریچر لے آئے۔

"یہ کیا ہے ——؟" صدر ماؤ نے ہنستے کہا "تم پھر یہ چاہتے ہو کہ میں اس پر سوار ہوں؟"

میں نے کہا —— "آپ بہت تھک گئے ہیں تمام کامریڈ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس پر سوار ہوں اور وہ آپ کو اٹھا کر لے چلیں"

صدر ماؤ پیدل چلتے رہے۔ انہوں نے کہا "ہر شخص تھکا ہوا ہے۔ تم مجھے اٹھا کر لے چلنا چاہتے ہو لیکن میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ کسی کے کندھوں پر سوار ہوں۔ لانگ مارچ کے دوران بھی ہمارے پاس سٹریچر موجود تھے لیکن ہم انہیں صرف بیماروں اور زخمیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسٹریچر پر سوار ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو تم بیمار ہو یا بُری طرح زخمی ہو!"

ہم نے بہت پہلے یہ سُن رکھا تھا کہ جب ہماری فوجیں لانگ مارچ کے دوران شمالی شینسی پہنچی تھیں، اور ہمارے عوام چھیبہ لوچین کے مقام پر لڑ رہے تھے تو صدر ماؤ بیمار پڑ گئے اور انہیں اسٹریچر پر سوار کرا کے محاذ پر لے جایا گیا تھا تاکہ وہ براہ راست لڑائی کی کمان کر سکیں۔ چنانچہ اب جب ہم نے ان کے مُنہ سے یہ الفاظ سنے تو ہم اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ دن کے وقت جب ہم مارچ کرتے تو سورج آگ اگلتا ہوتا۔ ہمارے جسم پسینے میں ڈوب جاتے لیکن ہمیں سب سے زیادہ اپنے رہنماؤں کی فکر ہوتی تھی۔ ہم جس رُخ پر مارچ کر رہے تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم چھیاشین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بعض سپاہی یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم دریائے زرد کو عبور کریں گے یا نہیں۔ بہت سے لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ صدر ماؤ اور دوسرے رہنماؤں سے کہا جائے کہ وہ ہم سے پہلے دریا عبور کر لیں اور دشمن سے محفوظ ہو جائیں۔ کیا وہ مشرقی سمت سے لڑائی کی کمان نہیں کر سکتے؟ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے ایک آواز سنائی دی ——— "نائب صدر چو بیمار ہو گئے ہیں" یہ سن کر صدر ماؤ پریشان ہو گئے تفصیل معلوم کرنے کے بعد انہوں نے کہا:

"جلدی سے اسٹریچر لے جاؤ اور نائب صدر چو کو اس پر بٹھا کر لے آؤ!"

ہم نے جلدی سے اسٹریچر اٹھایا اور پیچھے کی طرف دوڑ پڑے۔ نائب صدر چو بہت مضمحل نظر آ رہے تھے اور ان کی ناک سے خون جاری تھا۔ وہ گھاس پر بیٹھے ہوئے آرام کر رہے تھے، جب ہم اسٹریچر لے کر ان کی طرف جھپٹے تو انہوں نے کہا

"بہتر ہے تم لوگ واپس جا کر صدر ماؤ کی دیکھ بھال کرو میں چند لمحوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا!"

اسی وقت کامریڈ چیانگ چینگ بھی وہاں آ گئیں ہم نے بار بار اصرار کیا تب کہیں جا کر وہ اسٹریچر پر سوار ہونے پر رضامند ہوئے۔ دوسرے رہنماؤں کی طرح نائب صدر چو بھی مارچ کے دوران بہت مصروف رہتے تھے وہ بہت کم کھاتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ وہ تمام مسائل پر، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، ذاتی طور پر توجہ دیتے تھے۔ وہ اکثر صدر ماؤ کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ بٹانے کے لیے صدر ماؤ کے بھی بعد سوتے تھے اور ان سے پہلے ہی اٹھ جاتے تھے سوائے اس وقت کے جب کہ کوئی اہم ریڈیو پروگرام موصول ہوتا۔ وہ ان کی مصروفیات میں کبھی حارج نہیں ہوتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک یا دو گھنٹے کی نیند کے دوران ان کے سیکرٹری کو انہیں کئی بار جگانا پڑتا۔ ان کے جوتے بالکل گھس چکے تھے لیکن انہوں نے کسی کو معلوم نہیں ہونے دیا کہ کامریڈ

پراعتماد مسکراہٹ

پرسکون چہرہ

ان کے جذبوں

کو قوت بخش

رہا تھا

ان کی خاطر پریشان ہو جائیں گے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جیسے ہی اسٹریچر پر سوار ہوں گے جوتے کے سوراخ سب کو نظر آ جائیں گے۔

کامریڈ چیانگ چنگ نے کہا ——— "نائب صدر چو آپ کے جوتے کے نیچے سے آپ کے موزے جھانک رہے ہیں"

نائب صدر چو ہنس پڑے ——— "کیا واقعی جھانک رہے ہیں؟ اب پتہ چلا کہ سڑک پر چلتے وقت میرے پاؤں میں دھچکے سے کیوں لگے تھے۔"

اس وقت تک اسٹریچر صدر ماؤ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نائب صدر چو پھر اتر کر پیدل چلنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ صدر ماؤ نے جلدی سے ان کو پکڑ کر بٹھا دیا۔ اسٹریچر کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر چلتے ہوئے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "ایک سپاہی کو ایک ہزار دن تک تربیت دینا تاکہ اسے ایک بار استعمال کیا جا سکے۔ آخر تمہارا یہ اسٹریچر کام آ ہی گیا۔ اسے کہتے ہیں ——— اگر تم ہمیشہ تیار رہو گے تو کبھی غلطی نہیں کرو گے۔" ہر شخص ہنس پڑا۔

پیچھی سے "۲۰ لی" دور ہماری فوج شاہراہ کو چھوڑ کر مشرق کی طرف ایک وادی میں داخل ہو گئی۔ آدھے دن کی مسافت کے بعد ہم وو لنگ پو نامی منڈی میں پہنچ گئے۔ ہمیں سڑک پر بہت کم لوگ نظر آتے تھے لیکن اس وادی میں داخل ہوتے ہی بے شمار لوگ دکھائی دیئے۔ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اور سڑکوں کے کنارے بہنگیوں پر سامان اٹھائے چل رہے تھے، جب ہم اور اندر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ بازار میں کوئی نمائش لگی ہوئی ہے بہت سے لوگ اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں اور دھڑا دھڑ چیزوں کی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ ہر جگہ خوش مذاق اور زندہ دل لوگوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ یہ جگہ اب تک دشمن کے قدموں سے محفوظ رہی تھی۔ اسی لیے لوگ معمول کے مطابق سکون کے ساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ جب صدر ماؤ نے یہ دیکھا تو انہوں نے فوراً عوامی کام کے شعبے کے کامریڈوں سے کہا کہ وہ ان لوگوں سے ملیں اور انہیں اس بات کا احساس دلائیں کہ جب دشمن یہاں آئے تو انہیں اپنی تمام چیزیں چھپا دینی چاہئیں۔ اس پُر رونق منڈی میں ہماری فوج کو مارچ کرتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان میں سے کسی نے پہچان لیا کہ فوج کے آگے آگے چلنے والا شخص صدر ماؤ ہے مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لوگوں نے اپنے بانٹ ترازو ایک طرف پھینکے اور اپنے تھیلے کمر سے لٹکائے ہوئے آگے کی طرف دوڑنے لگے ——— پورا شمالی شینسی جنگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ان مشکل حالات میں جب عوام کو اپنے اس رہنما کا خیال آتا تو ان کی مشکلات کا بوجھ کم ہو جاتا اور وہ یہ محسوس کرتے کہ فتح ان کی ہے اور خوشیاں ان کا انتظار کر رہی ہیں اور اس وقت صدر ماؤ ہنوز شمالی شینسی میں موجود تھے اور دکھ سکھ میں ان کے شریک تھے۔ ان کی پراعتماد مسکراہٹ، ان کا پرسکون چہرہ ان کے جذبوں کو قوت بخش رہا تھا۔ انہیں اپنے سینے میں اُمڈتے ہوئے جذبات پر قابو نہیں رہا اور وہ اپنی محبتوں کا اظہار کرنے کے لیے پوری قوت سے نعرے لگانے لگے ——— "صدر ماؤ ——— زندہ باد .....!"

صدر ماؤ نے جو اپنے گھوڑے پر سوار تھے مشفقانہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا لوگوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پوری فوج کے گرد انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہمارے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا۔ عوامی کام کے سیکشن کے کامریڈوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی مستعدی کے ساتھ اپنے پراپیگنڈے کا کام شروع کر دیا۔

ہم نے وہ رات وو لنگ پو میں گزاری اور صبح کو مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ جھٹ پٹے کے وقت اچانک ہمیں آندھی نے آ گھیرا۔ آسمان میں بجلی کڑکنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم سر سے لے کر پاؤں تک بھیگ گئے۔ ہر شخص کے جسم پر پانی کا چشمہ ابل رہا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی اور ہوا اتنی منہ زور تھی کہ ہم اپنی آنکھیں تک نہیں کھول سکتے تھے۔ ہمارے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا اور ہمیں ایک گاؤں میں رہ کر پناہ لینی پڑی۔

اس گاؤں کا نام ژاؤ سوانگ تھا۔ ہمیں وہاں ایک تاریک سا غار مل گیا اور صدر ماؤ نے آئندہ راہِ عمل پر غور کرنے کے لیے فوراً ایک میٹنگ طلب کر لی اور اس وقت بھی پانی ان کے کپڑوں سے ٹپک ٹپک کر نیچے بہہ رہا تھا ہوا "سائیں" "سائیں" کر رہی تھی اور ہمارے گھوڑے زور زور سے ہنہنا رہے تھے۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ

SUIYUAN PROVINCE
SHENSI PROVINCE
SHANSI PROVINCE
Yellow River
Yulin
Liangchiacha
Tsaochuang
Chiahsien
Shenchuanpao
Shachiatien
Wulungpu
Hengshan
Michih
Yangchiakou
Shuanghuyu
Yenchiacha
Chilinkou
Chouchiayu
Chingpien
Suiteh
Chikou
Shihwan
Tientzuwan
Chingyangcha
Wupao
Hsiaoho
Wangchiawan
Chienyucha
Jenchiashan
Tsaolinkou
Wayaopao
Wangchieping
Chingchien
Yangmaho
Chihtan
Panlung
Ansai
Chinghuapien
Chakou
Yenchuan
Yenan
Yenchang
Nanniwan
Kanchuan

شمالی شینسی میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں مرکزی کمیٹی کمیونسٹ پارٹی کی مارچ کی کہانی نقشے کی زبانی

الفتح

نائب صدر چو کے جوتے میں کئی جگہ سوراخ ہو گئے تھے

اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ سو چکے تھے چند پرانے درختوں نے ہمیں اپنے دامن میں پناہ دی۔ ہر شخص ان کے نیچے ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھ گیا ایک شخص کی نظر کسی غار کے لیمپ کی دھندلی دھندلی روشنی پر پڑی تو اس نے کہا ——— "دریائے زرد بالکل ہمارے سامنے ہے اس بار ہم یقیناً اسے عبور کریں گے !"

اچانک ایک ساتھ سات آٹھ آوازیں بلند ہوئیں۔ صدر ماؤ نے ہمیں بتایا تھا کہ "جب تک ہم دشمن کو تباہ نہیں کر لیں گے اس وقت تک ہم دریائے زرد کو پار نہیں کریں گے !" واقعی ٹھیک اسی وقت کامریڈ جن پی شیہہ بارش میں بھیگتے ہوئے دوڑتے ہوئے وہاں آئے اور انہوں نے بتایا۔ "ہماری سمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی، ہم اپنے پرانے راستے پر مارچ کرتے رہیں گے !"

ہمیں اپنے رہنماؤں کے انداز سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ بہت جلد ایک بہت بڑی لڑائی ہونے والی ہے۔ کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ بعد میں ہماری شمال مغربی فیلڈ آرمی کے دلیر اور باصلاحیت سپاہی چاروں طرف سے شاچیاچین کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور انہوں نے دشمن کے ۳۶ ویں ڈویژن کو پوری طرح محصور کر رکھا ہو گا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہمیں یہ اطلاع ملی کہ لیوکان کی قزاق فوج وولنگ پو سے روانہ ہو چکی ہے۔ کامریڈ جن پی شیہہ نے صدر ماؤ کو اس کی رپورٹ دی۔

"خوب ——— !" صدر ماؤ نے کہا ——— "اگر دشمن اتنی مستعدی کا مظاہرہ کر رہا ہے تو ہمیں بھی روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

آندھی کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ جب بجلی چمکتی تھی تب ہی ہمیں اپنا راستہ سجھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد پھر ہم اندھیرے میں گھر جاتے اور ہمارے لیے تیزی سے چلنا ناممکن ہو جاتا۔ ہمیں اوپر پہاڑ کی چوٹی سے چشموں کے گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو یہ الفاظ پہنچائے "ہوشیار رہو ——— !" پوری قوت سے چیخنے پر بھی خود ہم اپنی آواز مشکل سے سن سکتے تھے۔

طلوع آفتاب کے وقت آخر بارش ختم ہو گئی۔ ہماری فوجیں دریائے چیالو کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ اوپر اور نیچے چاروں طرف، تمام پہاڑ پانی سے سفید نظر آ رہے تھے۔ بس یوں سمجھ لیجئے، یہ پانی کی دنیا تھی۔ یہاں دریائے چیالو کا پاٹ اچانک چوڑا ہو گیا تھا ——— اور آگے کا راستہ مسدود تھا۔ یہ بالکل غیر متوقع حادثہ تھا۔ ہم بہت پریشان تھے اور ہمارے جسم پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر اتنے اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے کہ ان کی چوٹیاں نظر نہیں آتی تھیں اور ان کے درمیان دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہم نے جس وقت مارچ شروع کیا تھا اس کے حساب سے دشمن غالباً ہم سے زیادہ سے زیادہ ۳۰ لی دور تھا۔ خطہ ہماری راہ میں مشکلات پیدا کر رہا تھا اور ہمارے پاس اس وقت محافظوں کا صرف ایک چھوٹا سا دستہ موجود تھا۔ کیا ہم اتنی دیر تک دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے کہ اس دوران ہمارے رہنما بحفاظت دریا عبور کر لیتے۔ میں نے صدر ماؤ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گول سی چٹان پر بیٹھے ہوئے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ میٹنگ کر رہے تھے۔ وہ سب باتیں کرتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اچانک ہمیں پیچھے سے بندوقیں چلنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد توپ خانہ بھی گرجنے لگا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت ہماری فیلڈ آرمی کا ایک یونٹ پہلو سے دشمن پر حملہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ صدر ماؤ بڑے پر سکون انداز میں کھڑے ہو گئے۔

"ٹھیک ہے !" انہوں نے کہا ——— "ہم اسی طرح کریں گے !"

کامریڈ جن پی شیہہ نے فوراً مارچ کا حکم دیا۔ ہمارے دستے نے عارضی طور پر اپنا رخ تبدیل کر دیا اور اچانک مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں پہاڑ بہت اونچے تھے اور چٹانیں بالکل عمودی تھیں۔ پہاڑی راستے بڑے ناہموار تھے۔ نچلی ڈھلانوں پر تو کم از کم ایک چکر دار راستہ موجود تھا لیکن جب ہم اوپر پہنچے تو دیکھا کہ چاروں طرف دھند چھائی ہوئی ہے اور ہر طرف بادل اڑ رہے ہیں۔ کہیں ایک تنگ سا راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ صدر ماؤ اپنے گھوڑے سے اتر گئے اور انہوں نے پکار کر کہا :۔

"اوپر کی طرف بڑھو !" اور وہ خود لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے سب کے آگے چلنے لگے۔ کامریڈ وانگ تنگ شنگ نے ہمارے محافظوں کے دستے کے پیچھے آنے والے سپاہیوں کو ہدایت دی کہ وہ تمام نشانات مٹاتے رہیں، تاکہ دشمن کو ہماری سمت کی تبدیلی کا علم نہ ہو سکے۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" صدر ماؤ نے کہا "اگر ہم یہاں ایک بورڈ لگا دیں گے کہ ماؤ زے تنگ شمال مغربی پہاڑوں میں جا رہا ہے تو بھی یہ احمق گاؤدی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے !"

(باقی آئندہ)

انقلاب کی راہ میں ترقی پسند عناصر کی غلطیاں — (۲)

مغربی پاکستان کے جاگیرداروں نے فوجی آمریت کا سہارا لیکر بنگال میں خانہ جنگی کرادی

ایوب حکومت کے زوال کے دوران پاکستان کے دونوں حصوں میں مزدور محاذ پر بہت سارے پرجوش کارکن نمودار ہوئے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو انقلاب کی منزل کسی شارٹ کٹ کے ذریعے طے کرنے کے خواہشمند تھے۔ ایسے پرجوش انقلابیوں کی کوششوں سے اتنا بہرحال ضرور ہوا کہ ملک میں پہلی بار طبقاتی احساس اور طبقاتی نفرت اس شدت کے ساتھ ابھری کہ پاکستان کے دائیں بازو کو بوکھلا کر اسلام کا سہارا لینا پڑا۔ حالانکہ معاشی جنگ کے اس الاؤ میں مذہبی اشتعال کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہمارے معاشرے میں مذہب کی اپنی جگہ الگ ہے اور بلند ہے جہاں ملک کے عوام میں اتنی شدت سے طبقاتی شعور پیدا ہوا اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نفرت ابھری، وہیں ترقی پسند طاقتوں میں تنظیم، ڈسپلن اور مرکزی قیادت، حالات کے تجزیہ اور صحیح راہِ عمل کے فقدان کی وجہ سے عوام کی سرکشی گروہی اور شخصی انارکزم میں بدل گئی۔ آج پورے ملک میں یہی صورتِ حال برقرار ہے۔

ایوبی آمریت کا خاتمہ، جمہوریت کا سہانا خواب، یحییٰ خان کے وعدے، الیکشن کی گہما گہمی، ترقی پسند عناصر کی افراتفری سرمایہ دارانہ قیادت کا فقدان اور جاگیردارانہ مفاد پرستی نے ملک کو ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا جس میں سوائے خانہ جنگی کے دوسری کوئی راہ نہ تھی۔ عوامی لیگ کا چھ نکاتی پروگرام عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں تھا۔ چھ نکاتی پروگرام کا مقصد بنگال کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کا تحفظ اور فروغ تھا۔ ملک کے ۲۲ خاندان جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے لیڈروں کی حیثیت رکھتے ہیں، بنگال کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا کوئی فارمولا پیش کرنے سے قاصر رہے۔

یہ ۲۲ سرمایہ دار خاندان گو کہ حکومت ان کے مفاد میں بنتی تھی، اتنا اثر و رسوخ پیدا نہیں کر سکے کہ بنگال کے سرمایہ داروں کے چھ نکاتی پروگرام سے کوئی سمجھوتہ کر سکیں۔ جب یہ بات یقینی ہو گئی کہ سمجھوتہ ناممکن ہے تو بنگال کے سرمایہ داروں نے اپنے مفاد کی خاطر جدوجہد کا آغاز کیا۔

اس وقت ہم اس مسئلہ پر زیادہ بحث نہیں کریں گے بلکہ صرف یہ کہہ کر اکتفا کریں گے کہ الیکشن کے بعد بنگال کی سرمایہ دارانہ قیادت جب پاکستان قومی اسمبلی میں مکمل طور پر اکثریت میں آ گئی اور جب اس کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے ہر مقصد کو بغیر مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کئے بغیر قومی اسمبلی میں قانونی حیثیت دے سکے تو ملک کے جاگیرداروں نے فوجی آمریت کا سہارا لے کر بنگال میں خانہ جنگی کا آغاز کیا جس کا یقینی نتیجہ ملک کے دو ٹکڑے ہونا تھا۔

اس تمام دور میں مغربی پاکستان کے ترقی پسند عناصر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور اس مسئلہ پر ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی خاموشی ہے۔ انہوں نے حقیقت کا تجزیہ نہیں کیا اور خود فریبی کا شکار رہے۔ بہت سے انقلابی دوستوں نے انقلابِ چین کی راہِ عمل کو سمجھے بغیر بنگال کے تمام تر عوام کی تحریک کو علیحدگی پسندانہ تحریک سمجھ کر رد کر دیا اور یحییٰ خان کی آمریت کے جبر و تشدد اور اَن گنت مظالم پر چپ رہے۔ اس تحریک کی قیادت پہلے عوامی لیگ کے ہاتھ میں تھی مگر آہستہ آہستہ یہ تحریک، ایک ترقی پسند تحریک میں تبدیل ہو


تحریر
عابد زبیری

رہی تھی جس کا مقصد پاکستان سے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ اور پاکستان کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داری نظام کی قیادت میں ایسی تبدیلی لانا تھا جس میں کہ ۲۲ خاندانوں کی اجارہ داری ختم ہوتی تھی۔

ہندوستان کا ہمیشہ سے مقصد، پاکستان کو کمزور کرنا تھا۔ جب تک مشرقی بنگال کی جدوجہد ایسے حدود میں رہی جو کہ اس کے اپنے مفاد میں تھی۔ وہ اس کو ہوا دیتا رہا اور ہر طرح کی مدد کرتا رہا۔ بھارت یہ ضرور چاہتا تھا کہ بنگال پاکستان سے الگ ہو جائے۔ مگر عوامی لیگ کے زیرِ حکومت رہے۔ جب تحریک ترقی پسند عناصر کے ہاتھ میں آنے لگی۔ اور مسئلہ صرف وقت کا رہ گیا تو ہندوستان کی بوکھلاہٹ کی انتہا نہ رہی۔ جب بھارت نے یہ دیکھا کہ مشرقی بنگال میں بجائے عوامی لیگ کی حکومت کے، ایک ایسا ترقی پسند عنصر پاکستان کی فوج کے ساتھ برسرِ پیکار ہے جو کہ عوامی جمہوریت کا قائل ہے۔ یہ ترقی پسند عناصر ان کے رجحانات، خود بھارت کے سرمایہ داری نظام کی نفی کرتے ہیں تو اس سے پہلے کہ یہ ترقی پسند انقلابی عناصر پاکستان کے ایک صوبے میں عوامی راج قائم کرنے کے قابل ہوں۔ وہ خود اپنی فوجیں لے کر مشرقی پاکستان پر چڑھ دوڑا۔ اور اس پر جارحانہ طور پر قبضہ کر کے عوامی لیگ کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس تمام دور میں ہمارے مغربی پاکستان کے ترقی پسند دوست اور ساتھی اپنی بغلیں بجاتے رہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دبا کر اپنی تصوراتی دنیا میں انقلابی راہوں کا تعین کرتے رہے اور ان کی اپنی زبان میں "ڈانڈے ملانے میں بھیڑا ہو گیا":

ملک میں معروضی قوتوں سے معاشی پیداواری رشتوں کی طبقاتی کشمکش اور بحران، ریت میں منہ چھپا کر تصوراتی دنیا میں کھو جانے سے نہیں رکتا۔ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ مقامی طور پر تحریکیں استحصال کے خلاف جنم لیتی ہیں جو صحیح قیادت کی غیر موجودگی میں استحصالی قوتوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ان ہی حالات نے سرحد میں کسانوں کی تحریک، سندھ میں ہاریوں کے اقدامات، دورِ حاضرہ میں مزدوروں کی خود رو تحریک کو جنم دیا۔ جب تک یہ منظم نہ ہوں اور جب تک ان کی مرکزی قیادت نہ ہو انقلابی جدوجہد کی تحریک میں نہیں آ سکتیں۔ اب بھی وقت ہے کہ تمام انقلابی گروہوں کی قیادتیں ایک جگہ مل کر، عوام کی اس

معاشی جنگ کے الاؤ میں مذہبی اشتعال کی کوئی گنجائش نہیں

ابھرتی ہوئی تحریک کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کریں۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کسی طرح بھی عوامی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ اس کی تمام تر اصلاحات موجودہ نظام کو قائم رکھنے کے لیے کی گئی ہیں۔ زندگی کے بیموں کو قومیانے کا مقصد ایک سو تیس کروڑ روپیہ حاصل کرنا ہے جس سے کہ حکومت کا کاروبار چل سکے۔ موجودہ حکومت غیر عوامی راہ سے آئی ہے اور نہ ہی عوامی راہ پر چلے گی۔ یہ ایک آمریت کا تحفہ ہے۔ مارشل لاء کی پیداوار ہے اس کا راستہ بھی وہی رہے گا جو کہ آمریت کا ہوتا ہے جو ملک کو فاشسٹی آمریت کی طرف لے جائے گا۔

حالیہ زرعی اصلاحات کے نتیجے میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ملک سے بڑے زمینداروں کا وجود ختم ہو جائے لیکن اس نفسیاتی مرحلہ میں جبکہ زرعی معیشت سے وابستہ ۸۰ فیصد آبادی بڑے زمینداروں کی گرفت سے نکلنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اگر کسانوں میں انقلابی تنظیمیں بنا کر انہیں نظریاتی طور پر مسلح کرنے کے ساتھ ساتھ انقلابی جدوجہد کے لیے تیار کیا گیا تو بلاشبہ آنے والے چند برسوں میں پاکستان میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ہوگا؟ ہر ایک شخص اپنے آپ کو انقلابی سمجھتا ہے مگر دیہات میں کام کرنا نہیں چاہتا، شہروں میں رہ کر مزدوروں کی معاشی کمزوری کو ابھارتا ہے۔

مارشل لاء کا استعمال اس وقت بھی اسی انداز میں طلباً مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کے خلاف ہو رہا ہے جس طرح پہلے ہو رہا تھا۔ صدر بھٹو کی پہلی تقریر کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ ——— "یہ نظام کی خرابی ہے۔" یہ نظام کس کا ہے؟ جاگیرداروں، زمینداروں اور ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کا! ان کے اہلکاروں کی حکومت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے... اور آگے کا پتہ نہیں! گروہ بندی کا خود بھی شکار رہتا ہے اور مزدوروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ ہر ترقی پسند اور ہر انقلابی کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے سے مکمل طور پر واقف ہو اور اس معاشرہ کے بنیادی تضاد سے ابھرتی ہو طبقاتی کشمکش کو تیز کرے۔ تمام تر ساتھی اس بات پر متفق ہیں کہ پاکستان کے معاشرے کا بنیادی تضاد کسان اور زمیندار جاگیردار کا ہے مگر اسی بنیادی تضاد کے ابھارنے میں اور اس طبقاتی جدوجہد میں بہت کم لوگ سرگرم عمل ہیں۔

ہر جگہ اس وقت چھوٹے چھوٹے ترقی پسند گروہ کام کر رہے ہیں۔ چند ساتھی دیہاتوں میں بھی کام کر رہے ہیں۔ دو ایک ماہ میں فصل کی کٹائی ہونے والی ہے۔ زمیندار کو علم ہے کہ اس دفعہ کٹائی اور بٹائی میں ہاری، کسان کاشت کار اس کو پہلے کی طرح لوٹ کھسوٹ کا موقع نہیں دیں گے۔ پورے ضلع حیدر آباد میں ٹنڈو قیصر کی تحریک ابھر رہی ہے۔ سندھ کا بڑا جاگیردار اس تحریک کو موڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ ان کو علم ہے کہ وہ اس تحریک کو مکمل طور پر کچل نہیں سکتے۔ سندھ کے جاگیرداروں کی قیادت پیپلز پارٹی پر قابض ہے۔ پیپلز پارٹی کی اس جاگیردارانہ قیادت نے پنجاب کی مڈل کلاس قیادت سے سمجھوتہ سوشلسٹ بنیادوں پر کیا ہے۔ دونوں قیادتوں کے ملاپ میں مغربی تعلیم اور مغربی معاشرے کی ہمنوائی شامل ہے۔ دونوں قیادتوں کے ملاپ میں ایک بات اولیت رکھتی ہے اور وہ ان کی سرمایہ داری نظام کی مخالفت ہے۔ پنجاب کی مڈل کلاس ترقی پسند ہونے کی وجہ سے سرمایہ داری کی مخالفت کرتی ہے اور معاشی مساوات کی قائل ہے۔ سندھ کی جاگیردار قیادت اپنے بچاؤ کی خاطر سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کرتی ہے۔

سرمایہ داری نظام کا اولین اصول زمینداری اور جاگیرداری کا خاتمہ ہے۔ یہ دونوں نظام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ آج کل مخلوط معاشی نظام کے نعرہ کا مطلب جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو ملا کر چلانا ہے گو کہ مڈل کلاس یہ سمجھ رہی ہے کہ اس نعرے کا مطلب سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظام کا ملاپ ہے۔

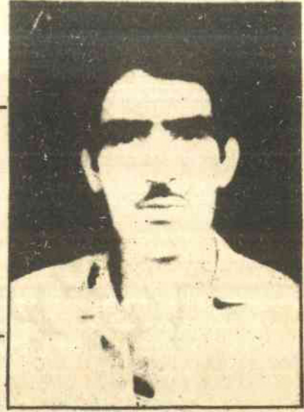
اِن حالات میں سندھ کا جاگیردار اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنے ہاریوں کو اپنے ہاتھوں کچل نہیں سکتا مگر اس کو فصل کی بٹائی بھی چاہیے۔ بغیر اس کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ہی اس کی آمدنی ہے اس صورت میں جاگیردار قومیت اور زبان اور ثقافت کے مسئلہ کو اٹھا رہا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک ایسا موڑ اختیار کرلے کہ وہ ہاری کی قیادت کر سکے۔ اس کے لیے وہ نئے سندھیوں کی زمینوں پر فصل کے موقع پر ہاری کو ابھار کر حکومت سے پٹوانا چاہتا ہے۔ ہر ترقی پسند کو اس موقع پر ہاری کا ساتھ دینا چاہیے اور قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر اس عمل کو بڑے جاگیردار کی زمینوں تک پہنچانا چاہیئے۔

سندھ کا بڑا جاگیردار یہ چاہتا ہے کہ ہاری اور نئے سندھی زمیندار کے جھگڑے کھڑے کر کے ہاری کی اتنی پٹائی کی جائے کہ یہ ابھرتی ہوئی تحریک ختم ہو جائے ہر ترقی پسند کا فرض ہے کہ وہ ہاری کی مدد کرے اور اس کو فنّی اور قانونی مدد دے تاکہ یہ تحریک قومی منافرت کے بجائے طبقاتی جدوجہد کا رُخ اختیار کر سکے۔ جو کہ اس کا اپنا رُخ ہے۔

تمام ترقی پسند اور انقلابی گروہوں کا اب فرضِ اولین ہے کہ وہ ملک کی معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کریں۔ یہ معاشی ترقی صرف جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے خاتمے سے ہی ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو اب نیم جاگیردار نیم سرمایہ دار اور بیوروکریسی کی حکومت ہی تسلیم کرتی ہے کہ زمینداری اور جاگیرداری نظام فرسودہ ہو گیا ہے اس کو بہتر بنانے کے لیے اصلاحات کا نافذ ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ ہر زمیندار اور ہر جاگیردار معاشی نظام میں صرف ایک کام کرتا ہے۔ وہ کاشتکار سے بٹائی لیتا ہے اور اس کا تقریباً ایک فیصد حکومت کو دیتا ہے۔ بٹائی میں وہ کاشت کار کے لیے صرف اتنا چھوڑتا ہے کہ وہ بمشکل ایک وقت کی روٹی کھا سکے اور حکومت کو اتنا دیتا ہے کہ وہ بمشکل چل سکے۔ باقی اس کے عیش و عشرت پر صرف ہوتا ہے۔ اگر عوام کے پاس ملک کے ۸۵ فیصد لوگوں کے پاس ایک وقت کی روٹی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا تو ان کی قوت خرید نفی میں ہی رہے گی۔ جب تک عوام کی قوتِ خرید نہیں بڑھتی، سرمایہ دارانہ نظام بھی پروان نہیں چڑھتا۔ کیونکہ ابھی تک سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے فروغ کے لیے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور ہر موقع پر جاگیرداری سے چمٹے رہے اس کے باوجود کہ ان کو بیوروکریسی کی مدد حاصل تھی اس لیے یہ زمینداری ختم کر کے عوام کی قوت خرید کو بڑھائے۔ مزدور کسان قیادت کا کام ہو گیا ہے۔ جب ملک کی صنعتی ترقی، معاشی ترقی، سرمایہ دار نہیں کر سکتا تو یہ کام سوشلسٹ عناصر کو کرنا ہوگا ملک کی صنعتی ترقی صرف مزدور اور کسان قیادت اول جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے اور دوئم گماشتہ سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ (باقی آئندہ)



سوشلسٹ معیشت کے نعرے پر عمل نہیں کیا گیا



خواجہ محمد
وارڈ ممبر مین انڈسٹریل ایریا لانڈھی

(۱) برسراقتدار آنے کے بعد پارٹی کے کردار کے بارے میں ہمارا تاثر یہ ہے کہ پارٹی نے ابھی تک جو کچھ بھی کیا ہے نیم دلانہ ہے مثلاً سب سے پہلے سرمایہ داروں اور اُن کے اہل خاندان کے پاسپورٹ ضبط کئے گئے مگر پھر واپس کر دیے گئے۔ داؤد اور ولیکا کو عالیشان کوٹھی میں قید کیا گیا جبکہ مساوات جس کا وعدہ کیا گیا تھا اس کے تحت انہیں بھی جیل میں مزدوروں کے ساتھ بند کرنا چاہیئے تھا تاکہ ان ظالموں کو بھی ان تکالیف کا احساس ہوتا جو وہ آئے دن دولت کے بل بوتے پر مزدوروں کو دلواتے ہیں۔ مگر انہیں تو کوٹھیوں کی نظربندی کی عیاشی سے بھی بہت جلد لوٹنے کی آزادی دے دی گئی۔ غیر ملکوں میں جمع شدہ سرمایہ واپس لانے کے لئے بڑی بڑی دھمکیاں دی گئیں اور مہلت پر مہلت دی گئی۔ آخری مہلت کے بعد یہ پتہ نہ چل سکا کہ کتنا سرمایہ واپس ہوا۔ ؟

یہ اور اسی طرح کے کچھ اور اقدام ایسے ہیں۔ جن کا اگر کارکن جواب طلب کریں تو پارٹی کہاں جواب سے قاصر ہے۔

(۲) جہاں تک عوام کی توقعات کا تعلق ہے۔ ان کی توقعات تو یہ تھیں جیسا کہ خود پارٹی نے نعرہ بلند کیا تھا کہ کارخانے اُس کے جو پہیہ گھمائے اور زمین اُس کی جو ہل چلائے ابھی تک اس نعرے پر عمل نہیں ہو سکا۔ چونکہ ملک اس وقت مشکلات میں پھنسا ہوا ہے۔ اسی لئے ملکی مفاد کی خاطر کارکن اور عوام خاموش ہیں۔

بہر حال عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ پارٹی کو اگر مستقبل میں حکومت کرنی ہے اور عوام کے غیض وغضب سے بچنا ہے تو عوام کی توقعات پوری کرنی پڑیں گی۔ ورنہ پارٹی کا حشر بھی کنونشن لیگ سے مختلف نہ ہوگا۔

(۳) پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان اس وقت پہلے کی طرح رابطہ نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ پارٹی کے بیشتر عہدے دار حکومت میں چلے گئے ہیں۔ اس طرح پارٹی کی طرف ان کی توجہ ختم ہو گئی ہے۔ پارٹی اس وقت تنظیمی انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔ ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خلاء اُسی وقت پُر ہو سکتا ہے کہ حکومتی عہدے دار اور پارٹی عہدے دار مختلف ہوں۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں سے رویّہ مختلف قسم کا ہے۔ کہیں اچھا ہے اور کہیں اچھا نہیں بھی۔ مخلص کارکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اُن کے ساتھ رویّہ کیسا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا عوام کے ساتھ رویّہ اچھا ہو۔ مزدوروں، کسانوں یعنی کچلے ہوئے طبقوں کے ساتھ رویّہ اچھا ہو وعدے پورے کئے جائیں تاکہ کارکن عوام کے سامنے اپنا سر فخر سے بلند کر سکیں۔

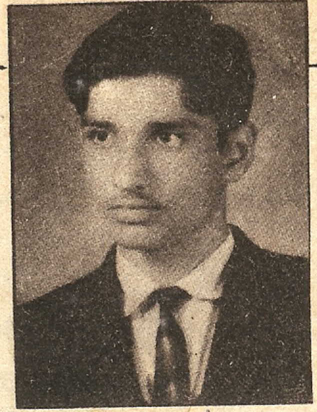
(۵) جہاں تک کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کا سوال ہے چونکہ پارٹی استحصال کے خاتمے کے لئے بنی تھی۔ مزدوروں اور کسانوں کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے بہتر تنظیم اس وقت قائم ہو سکتی ہے جبکہ ڈویژن اور حلقوں کی سطح پر بھی پارٹی کی قیادت نچلے طبقے کے ہاتھ میں ہو، مفاد پرستوں پر سخت نظر رکھی جائے اور ان لوگوں کو اپنی صفوں میں نہ گھسنے دیا جائے جن کا ماضی داغ دار ہے اور جنہوں نے انتخابات کے زمانے میں پارٹی کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پارٹی میں تنظیمی خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر ایسے مفاد پرست بھی پارٹی میں آ رہے ہیں جنہوں نے انتخابات کے زمانے میں کارکنوں کے ساتھ جگہ جگہ جھگڑے کئے اور پارٹی کے جھنڈے کو کفر کا جھنڈا کہا۔ مگر اب چونکہ پارٹی برسرِ اقتدار آگئی ہے اور یہ لوگ ہمیشہ برسر اقتدار ٹولے کی چمچہ گیری کر کے اپنے لئے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کارکن ان کے داخلے سے سخت پریشان ہیں۔ لہٰذا اگر تنظیم کو مضبوط بنانا ہے تو ان کا داخلہ بند کرنا ہوگا اور پارٹی کے پرانے کارکنوں کو بھی کسی قسم کے ناجائز فوائد حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے

(۶) جہاں تک پارٹی کے با اثر افراد کی مختلف ذرائع سے کمائی شروع کرنے کا تعلق ہے مفاد پرستوں نے شروع کی ہوگی۔ مگر ہمیں اس بارے میں علم نہیں۔

(۷) ہمارے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے چونکہ پارٹی کا منشور انقلابی ہے اور پارٹی سوشلزم کی دعوے دار ہے اسی لئے سوشلسٹ ملکوں کی طرح یہاں پر بھی پارٹی ہی کو کل اختیارات ہونے چاہئیں۔ پارٹی کے عہدے دار اور حکومت کے عہدے دار مختلف ہونے چاہئیں۔ اس وقت تک کسی بھی عہدے دار کو حکومت میں نہیں لینا چاہیئے جب تک اُس کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر نہ ہو جائے اور پارٹی کے عہدے دار کو حکومتی عہدیدار پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے تاکہ وہ غلطی کا مرتکب نہ ہو سکے۔

(۸) جہاں تک پولیس، نوکر شاہی۔ عدلیہ میں کارکنوں کی مداخلت کا سوال ہے۔ قانون شکنی کو روکنا مداخلت نہیں بلکہ یہ تو ہر شہری کا فرض ہے۔ پارٹی کے کارکنوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ افسر شاہی کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنی سابقہ روش بدلیں، اپنے آپ کو خادم سمجھیں اور عوام سے ہر معاملے میں انصاف سے پیش آئیں۔ اگر کسی شخص سے رشوت طلب کی جائے تو ظاہر ہے وہ غریب دوڑا ہوا پارٹی دفتر میں آتا ہے۔ کارکن اس وقت جذباتی ہو جاتے ہیں اور رشوت طلب کرنے والے کو منع کرنے کے لئے جاتے ہیں یہ کوئی مداخلت نہیں بلکہ برائیوں پر اسی طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ سابقہ حکومتیں زیادہ بدنام اسی وجہ سے ہوئی تھیں کہ اُن کے کارکن مخلص نہ ہونے کی وجہ سے ان برائیوں کی طرف توجہ نہ کر سکے۔

کارکنوں کو انتظامیہ پر نظر رکھنے کے لئے کھلی اجازت ہونی چاہیئے۔



قیادت اور کارکنوں میں کوئی رابطہ نہیں رہا

ناصر حسین کاظمی سیکشن کمانڈر پیپلز گارڈ - لائل پور

(۱) پیپلز پارٹی کے بر سر اقتدار آنے سے ہر عام آدمی یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ یہ پارٹی ہمارے حقوق کا تحفظ کرے گی۔ غریبی کو دور کیا جائے گا۔ جاگیرداری جیسی لعنت کو ختم کیا جائے گا۔ ملک کو نوکر شاہی سے آزاد کیا جائے گا۔ ہر شخص کو روٹی اور کپڑے کی ضمانت ملے گی اور آج تک جو پاکستان کے محنت کشوں پر ظلم کئے جاتے رہے ہیں ان کو ختم کیا جائے گا۔ لیکن ایسا لگتا ہے،

ہنوز دلی دور است

(۲) عوام نے جو توقعات پیپلز پارٹی سے وابستہ کی تھیں وہ شاید کبھی پوری نہ ہوں۔ کیونکہ پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ننگ و افلاس کو دیکھا تک نہیں۔ معراج محمد خاں اور شیخ رشید جیسے لوگ "مشیری اور وزیری" کو محنت کشوں کے حقوق کی جد وجہد پر قربان نہیں کر سکتے۔ ہم سمجھتے تھے کم از کم یہ لوگ تو محنت کشوں کے لئے کچھ کریں گے یا حکومت کو ایسا کرنے پر مجبور کریں گے لیکن اب وہ بھی خاموش ہیں۔ یہ حالات مجھ سے دیکھے نہیں جاتے۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیونکہ جس دن کو دیکھنے کے لئے ہم نے رات دن ایک کر دیا۔ ساری ساری رات جاگ کر لوگوں کو سمجھایا۔ تقریریں کیں۔ جلسے کروائے حتیٰ کہ پولیس سے سر بازار لاٹھیاں کھائیں لیکن ہم نے اس تحریک سے منہ نہ موڑا لیکن اب دکھ اس بات کا ہے کہ جو لوگ اس وقت ہمارے مخالف تھے۔ ہمارے جلسہ جلوسوں میں شامل نہیں ہوتے تھے جو ہمیں پاگل قرار دیتے تھے اور ہماری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ آج وہی لوگ بھٹو صاحب اور ہمارے ایم۔ این اے حضرات اور ایم۔ پی۔ اے صاحبان کے منظور نظر بن گئے اور مخلص کارکنوں کے لئے ان کے گھر کے دروازے بند ہو گئے۔ شاید انہوں نے وہ دن بھلا دیا کہ الیکشن کے دوران غریب کارکنوں نے اپنی جیب سے تانگوں اور ٹیکسیوں کا کرایہ ادا کیا۔

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں۔ اب پیپلز پارٹی بھی مسلم لیگ کی طرح بڑے لوگوں کی پارٹی کہلائے گی۔ صرف قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں اور ہائی کمان کے درمیان ہی کچھ رابطہ ہے اگر کارکنوں اور قیادت کے درمیان کوئی رابطہ ہوتا تو جے۔ اے۔ رحیم صاحب کراچی میں پارٹی ہیڈ آفس پر قبضہ کرنے والے کارکنوں کو بنیادی رکنیت سے محروم نہ کرتے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنما اب اپنے کارکن ساتھیوں کو پہچانتے تک نہیں۔ جب کوئی محنت کش کوئی فریاد لے کر جاتا ہے تو اُسے جھڑک کر آفس سے باہر نکال دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سفارش نہیں چلے گی۔ مگر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو مختلف محکموں میں جگہ دلوا دی جاتی ہے۔

پیپلز پارٹی کے

اتحاد اور تنظیم کیلئے تجاویز

(۱) پیپلز پارٹی کے ابتدائی یونٹوں میں الیکشن کروایا جائے اور صدر سیکرٹری منتخب کئے جائیں۔ اس کے بعد یونٹوں کے صدر اور سیکرٹری سٹی اور ڈسٹرکٹ کے صدر اور سیکرٹری کا چناؤ کریں۔ پھر اس کے بعد ضلع کے صدر

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن "الفتح" کے لئے لکھیں

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے کارکنوں اور عوام کے تعاون سے بر سر اقتدار آگئی ہے۔ اقتدار کے حصول کے بعد اس کے کارکنوں کا کیا کردار ہے۔ اُن کے اور اُن کے رہنماؤں کے درمیان کیا رابطہ ہے۔ یہ سب کچھ کارکنوں کی زبانی جاننے کے لئے ہم یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے کارکن منظم اور مضبوط ہو کر وطن دشمنوں پارٹی دشمنوں اور پارٹی کے منشور سے غداری کرنیوالوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تمام کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں۔ نیچے کچھ سوالات دیئے گئے ہیں۔ کارکن ان کے جواب ہمیں تفصیلاً لکھ کر بھیجیں۔ اس کے ساتھ اپنی (۱) تصویر (۲) کارڈ نمبر، (۳) پارٹی یونٹ اور (۴) یونٹ بھی لکھ کر بھیجیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) پیپلز پارٹی کے بر سر اقتدار آنے کے بعد آپ کا پارٹی کے کردار کے بارے میں پہلا تاثر کیا ہے؟

(۲) عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، اُن کے پورے ہونے کے کیا امکانات ہیں

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی ربط باقی ہے یا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں سے کیا رویّہ ہے۔

(۵) کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہے۔

(۶) پیپلز پارٹی کے با اثر افراد نے مختلف ذرائع سے کمائی شروع کر دی ہے۔ کیا آپ کے علاقے میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں۔

(۷) آپ کے خیال میں حکومت کو پارٹی پر کنٹرول کرنا چاہیئے یا پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

(۸) عام تاثر یہ ہے کہ آپ لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہے۔؟

اگر تو اسکول جائے گا تو پیسے کون لائے گا؟

احتشام زرّین فاروقی

قارئین! راشد جیسے بچوں کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں۔ ایسے بچّے اپنے گھروں کے لئے محنت مزدوری کرکے پیسے کماتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد جو کچھ کما کر لاتے ہیں اس میں گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ورنہ امیر ہو یا غریب کس کو اپنی اولاد سے پیار نہیں ہوتا۔ کون یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد سکھ کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ہمارے معاشرے میں مختلف طبقے ہیں۔ سب سے اونچا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو سرمایہ دار ہیں۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے جو درمیانے درجے کے لوگ کہلاتے ہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں ہوتی۔ مگر اس قابل ہوتے ہیں کہ گزر بسر کر سکیں۔ اور تیسرا طبقہ ایسے بدنصیبوں پر مشتمل ہوتا ہے جو زر و زمین کے مالکوں کے محکوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک دولت مند باپ کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ دولت کا مالک بنے۔ ایک درمیانے درجے کے باپ کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ایک اچھی اور خوش حال زندگی بسر کرے اور ایک نچلے طبقے کا باپ بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی اولاد کو اس سے کم مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن وہ مسائل اور الجھنوں کے جال میں کچھ اس طرح پھنسا ہوتا ہے کہ پوری کوشش کے باوجود بھی نکلنا آسان نہیں ہوتا، اور پھر اسی جدوجہد میں اس کے بچے شامل ہو جاتے ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ آٹھویں جماعت تک تعلیم مفت ہوگی۔ اب ہر بچّہ بغیر کسی فرق کے تعلیم حاصل کر سکے گا۔ اب تعلیم بیچی نہیں جائے گی۔ بلکہ بلا معاوضہ فراہم کی جائے گی۔ یہ قدم روشنی کی طرف بڑھا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو بچے دن بھر مزدوری کرتے ہیں وہ کس طرح تعلیم پائیں گے؟ ایسے بچوں کے پاس تو مفت تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی وقت نہیں ہوتا۔ ان بچوں کو سب سے پہلے اپنی اور اپنے خاندان والوں کی بھوک مٹانی ہوتی ہے۔ اگر ایک بچّے کے باپ یا کسی دوسرے سرپرست کی آمدنی اتنی نہیں کہ گزارہ ہو سکے۔ تو وہ اسکول جانے کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ اُسے بھی تو سارا دن محنت کرنی ہوتی ہے۔

راشد ہر وقت سیاہی مائل میلے کپڑے پہنے رہتا ہے۔ وہ کاروں کی مرمت کی ایک ورک شاپ میں کام کرتا ہے۔ بارہ تیرہ سال کا معصوم سا لڑکا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ اب تو پڑھائی مفت ہو جائے گی۔ تم بھی پڑھو گے؟ اُس نے جواب دیا کہ اُس کے ابا کہتے ہیں۔ اگر وہ اسکول جائے گا تو کام نہیں کر سکے گا اور پیسے کم ہو جائیں گے۔

اس کا باپ کسی دوکان میں کام کرتا ہے، لیکن راشد کو اس کی تنخواہ کے بارے میں علم نہیں۔ خود اس کو آٹھ آنے روزانہ ملتے ہیں۔ وہ صبح آٹھ بجے ورک شاپ آتا ہے اور شام کو چھ بجے چھٹی ملتی ہے۔ کام زیادہ ہوتا ہے تو دیر بھی ہو جاتی ہے۔ پورے وقت راشد کا یہ کام ہوتا ہے کہ استاد کے ساتھ کاروں کے انجنوں میں جھانکتا رہے اور استاد کو اوزار تھماتا رہے کبھی استاد ایک دو آنے فالتو دے دیتا ہے یا کار کا مالک اُس کے ہاتھ پر چند سکّے رکھ دیتا ہے۔ ہم نے راشد سے پوچھا کہ وہ فالتو پیسوں کا کیا کرتا ہے۔ تو کہنے لگا: "میں جب کسی کو آئسکریم کھاتے دیکھتا ہوں تو میرا بھی دل کرتا ہے۔ زیادہ پیسے ملتے ہیں تو میں آئس کریم کھاتا ہوں۔" یہ بات اُس نے مسکراتے ہوئے خوشی سے کہی۔ ہمیں ایسا لگا کہ جیسے یہی اس کی سب سے بڑی آرزو ہو۔ جتنا معصوم وہ خود ہے اتنی ہی معصوم اس کی خواہش ہے۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ اپنی ماں کو یہ بتا دیتا ہے کہ اس نے ٹپ کے پیسوں سے آئس کریم کھائی تھی تو اُسے بہت ڈانٹ پڑتی ہے اور وہ روتے روتے سو جاتا ہے۔ شاید اس کی ماں اس خیال سے ڈانٹتی ہو کہ ان پیسوں سے ضرورت کی کوئی چیز خرید سکتی۔ چھوٹے لوگوں کے لئے تو چار آنے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کس طرح کر سکتے ہیں۔

بچوں کو بہاروں کا پیامبر کہا جاتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں بہت سے بچّے ایسے ہیں جن کا کام در در کی ٹھوکریں کھانا اور غم روزگار میں مبتلا رہنا ہے۔ کچھ ورک شاپوں میں کام کرتے ہیں۔ کچھ پیٹرول پمپوں پر کام کرتے ہیں۔ کچھ کنگھے بال پن بیچتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو بھیک مانگتے ہیں۔ شاید آپ میں سے کسی نے ہل پارک پر بھیک مانگنے والے ایسے بچے بھی دیکھے ہوں جو لوگوں کے پھینکے ہوئے آئس کریم کے ڈبے اٹھا کر چوسنے لگتے ہیں۔ مفت تعلیم حاصل کرنے بھی وہی بچّے جا سکتے ہیں۔ جن کے ماں باپ ان کو روٹی کھلانے کے قابل ہیں۔ جو بچے اپنے بڑوں کے ساتھ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ وہ اس طرح وقت گنواتے رہیں گے۔ نہ جانے ان کے لئے سحر کب ہوگی۔؟

اردو سندھی تنازعہ

اردو کو نقصان مخالفین سے نہیں خیر خواہوں سے پہنچا ہے

اُردُو بزورِ طاقت سندھیوں پر مسلط نہیں کی جا سکتی

رند کیفی

صدرِ مملکت کی حالیہ تقریر نے اس آگ کو ٹھنڈا ضرور کر دیا ہے جو لسانی عصبیت کے نام پر بھڑکائی گئی تھی۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ یہ آتش تعصب ہمیشہ کے لئے بجھ چکی ہے کوتاہ فہمی ہے شر پسندوں کی شعلہ سامانیاں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ عصبیت کا یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے اور اس کے لاوے کی زد میں اگر صرف سندھ ہی نہیں پورا (رہا سہا) پاکستان نیست و نابود ہو سکتا ہے۔ صدرِ محترم کا یہ ارشاد کہ "اردو اخبارات جلانے سے اردو زبان نہیں جل جائے گی۔" اپنی جگہ اٹل سہی لیکن یہ حقیقت غالباً ان کی نظر میں نہیں کہ کاشانۂ اردو میں آگ تو گھر ہی کے چراغ سے لگی ہے۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اردو کو اتنا نقصان اس کے مخالفین نے نہیں پہنچایا جتنا کہ اس کے بہی خواہوں کے ہاتھوں اسے پہنچا ہے۔ اردو اور مقامی زبانوں کی نزاع نئی نہیں پاکستان میں وارد ہوتے ہی اردو کے نام نہاد خیر اندیشوں نے اپنے متکبرانہ رویہ سے مقامی زبانوں کے ہمدردوں کے دل و دماغ میں اردو کے خلاف جراثیم پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں بابائے اُردو کی طرف سے اردو کانفرنس کے انعقاد کے اعلان پر راقم الحروف نے ماہنامہ "بہار" (اپریل ۱۹۴۸ء) کے اداریہ کے ذریعہ اردو کے دوستوں کی توجہ بر محل اس جانب مبذول کراتے ہوئے لکھا تھا "—— جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے ارشادات گرامی کا تعلق ہے ہر بہی خواہ اردو ان کی آواز پر لبیک کہے گا۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض نادان دوست اردو کی حمایت میں ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ جاتے ہیں جس کا غیر اردو دان طبقوں پر بُرا اثر پڑتا ہے……وہاں یہ حجابات بھی دور ہو گئے کہ اردو پاکستان کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کی زبان ہے۔ یہ قصور سندھیوں، بنگالیوں اور بلوچستانیوں کا نہیں بلکہ ان حامیانِ اردو کا ہے جو آج تک مختلف صوبوں کے افراد کو یہ نہ سمجھا سکے کہ اردو ان کی زبانوں کے مقابلہ کی چیز نہیں، بلکہ انگریزی کی طرح اردو کو ہم پاکستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ چونکہ اُردو میں اور زبانوں کے مقابلہ میں رابطہ کی زبان ہونے کی صلاحیت زیادہ ہے…… اردو کی آواز پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچانا چاہیے۔ یہ کام پاکستان بن جانے کے بعد جتنا آسان تھا موجودہ تنگ نظری کے باعث اتنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے حکمت و مصلحت کا تقاضہ ہے کہ انتہائی خلوص، دیانت داری اور محبت سے کام لیا جائے ——" افسوس کہ مصالحت و موالنست سے کام لینے کے بجائے اردو پرستوں نے اپنا معاندانہ رویہ اور تیز کر دیا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ تنگ نظری کی خلیج روز افزوں وسیع و عمیق ہوتی چلی گئی۔ حتےٰ کہ آج ناقابلِ عبور نظر آنے لگی ہے۔ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم (اردو کے بہی خواہ) آج بھی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے رواداری کے جذبہ سے کام لیں تو یہ نفرت و عصبیت کی خلیج آج بھی پاٹ سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں محترمی سید محمد تقی صاحب نے روزنامہ "مشرق" میں اس مسئلہ پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ —— "وہ الفاظ کو چبانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ حقائق کو کھل کر کہا اور سنا جائے۔" لہٰذا جو بات تقریباً ربع صدی قبل میں نے اشاروں میں کہی تھی آج کھل کر بیان کر رہا ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ون یونٹ ٹوٹنے پر سندھی ادبی سنگت کراچی نے "جشنِ نجات" منایا تھا۔ اس پر طفیل احمد جمالی صاحب نے بت شکن کے روپ میں جو تیشہ زنی کی اس کی چند "جھلکیاں" ملاحظہ ہوں "…… سندھ میں آباد ہو کر ہم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا ہمیں اس صورت میں ملے گی کہ ون یونٹ ٹوٹنے کی خوشی میں جو مشاعرہ ہو گا، اس میں اردو کو جوتیوں میں بھی جگہ نہیں ملے گی …… حاضرین جلسہ نے "صرف" اس بات پر مل کر آٹھ آٹھ سولہ آنسو بہائے کہ پاکستان بننے کے بعد مستقل اردو کی سرپرستی کی جا رہی ہے …… بلکہ یہ مطالبہ بھی رسید کر دیا کہ سندھی زبان کو ایک عدد قومی زبان قرار دیا جائے۔ اگر اہلِ جلسہ یہ بھی فرما دیتے کہ سندھی کو قومی زبان قرار دینے سے قبل سندھیوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ آسان رہتا…… اب شیخ ایاز صاحب نے فرمان جاری فرمایا ہے کہ اے تارکین وطن تم جو ابھی تک اپنے نام کے ساتھ دہلوی اور لکھنوی لکھتے ہو آج سے اپنی اوّلین فرصت میں اپنے نام کے آگے سندھی لکھنا شروع کر دو۔ مثلاً اگر تمہارا تخلص کلیجہ ہے تو اپنے تخلص کے آگے ٹنڈو الہ یار خانوی یا الہہ دینو ں سانڈوی یا پڈ عیدنوی لکھنا شروع کر دو…… مگر مشکل یہ ہے کہ سندھ میں ایسے لوگوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ جو نہ روزانہ ایک نئی قوم کہلانے کو تیار ہے نہ اسے قابلِ عمل تصور کرتی ہے…… یہ بات ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آدمی چشم زدن میں پاکستانی سے سندھی یا بلوچ یا سرائیکی یا بہ وہی کیسے بن سکتا ہے…… ادھر (قومیت تبدیل کرنے سے) الگ ہماری شامت آ جائے گی اور ہم سب اردو بولنے والے جو اب شاید پاکستان میں تن تنہا پاکستانی رہ گئے ہیں……" جواباً گزارش ہے کہ مہاجرین نے سندھ میں آباد ہو کر کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن سندھیوں نے بھی تو اپنے زخم خوردہ بھائیوں کو سینے سے لگا کر کوئی ایسا فعلِ قبیح نہیں کیا کہ جس کے بدلے میں ان کی زبان و ثقافت اور معیشت بھی تباہ کر دی جائے۔ ان کا یہ ارشاد کہ "ہم اردو میں سہی لیکن بہر حال خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ ہمارے سندھی بھائیوں کو ون یونٹ کی آڑ میں شکار کھیلنے والے سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور افسر شاہی کے ظلم و استحصال سے نجات حاصل ہو گئی۔" اس حقیقت کا واضح اعتراف ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے نہ سہی ون یونٹ کے دوران سندھ ظلم و استحصال کا شکار رہا ہے۔ مزید یہ کہ اس جبر و استبداد کا نشانہ صرف سندھی ہی بنے ہیں۔ سندھ میں دیگر کثیر تعداد میں آباد لوگ اس کی زد میں نہیں آئے۔ تعجب ہے کہ اس اعتراف کے بعد بھی سندھیوں کے مل کر احتجاج کرنے کو "صرف" سمجھنا واقعی سندھیوں سے

"ہمدردی" کی دلیل ہے۔ اس "ہمدردی" کا مزید ثبوت سندھ کے علاقوں کے نام بگاڑ کر پیش کرنے سے بھی ملتا ہے۔ اگر اسے عصبیت پر محمول نہ کیا جائے تو پوچھتا چلوں کہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کیا ٹنڈو الہ یار خانوی اور الہ دینوی سانڈوی آپ کے جھنجھانوی، پھپھوندوی، ناندھڑھوی۔ چھندواڑھوی، بڑھیڑاوی سے زیادہ مضحکہ خیز ہیں۔ دست بھولئے! ظالم

خواہ کوئی ہو مظلوم کی فریاد و فغاں کا تمسخر اڑانے والے کو بھی مظلوم ظالم ہی سمجھتا ہے) اعتراض برائے اعتراض کی ایک اور مثال۔ اعتراض یہ ہے کہ اس جشن کے مشاعرہ میں اردو شاعروں کو مدعو نہیں کیا گیا لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی ہے کہ "یہ مشاعرہ صرف سندھی تک محدود رہا" کیا یہ بات کا بتنگڑ بنا کر منافرت کی آگ بھڑکانے کی کوشش نہیں۔؟ سندھیوں پر اردو دشمنی کا الزام لگانے والے "ناطقہ کو سر بگریباں" کرنے کے بجائے خود کیوں نہیں اپنے گریباں میں جھانکتے، بابائے اردو کی چہیتی بیٹی کا غم کھانے والے شاہ لطیف کی لاڈلی بیٹی کے حالِ زبوں پر کیوں افسوس نہیں کرتے۔ پھر یہ لوگ ان افراد اور اداروں کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔ جنہوں نے ذاتی اور جماعتی مفاد کی خاطر اردو کو اس قدر بدنام کر دیا کہ سندھی اسے اپنے صفِ اول کے دشمنوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔ اگر آج سندھی اردو کے خلاف صف بستہ ہو گئے ہیں تو بیارے اردو کے ان نادان دوستوں کی جذباتی لغزشوں کا ہی کیا دھرا ہے۔

بُت شکنی اچھا مشغلہ ہے لیکن ابراہیمی تیشہ اگر غزنویانہ انداز سے چلایا جائے تو بُت شکنی بُت گری بن جاتی ہے جو بائی تعصب کا بت لاریب قابل انہدام ہے لیکن اس ھبل کو گرا کر اس کی جگہ لسانی و ثقافتی لات و منات قائم کرنے کی کوشش تو بُت گری کے بجائے بُت پرستی کہلائے گی بُت شکنی نہیں۔

"خدا کی بستی" والے شوکت صدیقی صاحب نے الفتح (۴۰/۲) میں "پاکستانی قوم اور قومیتیں" کے موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ ان کے مارکسی اندازِ فکر کا معترف ہونے کے باوجود مجھے کہنے میں یہ باک نہیں کہ جہاں جہاں اردو اور علاقائی زبانوں، مہاجرین اور مقامی لوگوں کا ذکر آیا ہے۔ اس عوامی قلمکار کا لہجہ بھی استہزائیہ رنگ اختیار کر گیا ہے۔ فرماتے ہیں "اب مشورہ دیا جاتا ہے کہ کراچی میں رہنا ہے تو سندھی کہلاؤ۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ابھی تک مجھے وہ سانچہ نہیں ملا جس میں ڈال کر لوگ پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ بنائے جاتے ہیں۔ اگر مل بھی جائے تو کیا اس طرح انسانوں کو قومی سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ گر اس کا یہ بتایا جاتا ہے کہ سندھی بننا ہے تو سندھی سیکھو۔ کیوں سیکھوں؟ انگریزی اور فرانسیسی کیوں نہ سیکھوں پھر اردو میں کیا برائی ہے۔" توبہ کیجئے صاحب اردو میں بھلا برائی ہو سکتی ہے۔ برائی تو سندھی کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں۔ لہٰذا آپ سندھی ہرگز نہ سیکھیں۔ لیکن یہ تو بتا دیں کہ آپ کس برتے پر سندھیوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اردو سیکھیں بلکہ اسے پاکستان کی واحد قومی زبان بھی تسلیم کریں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بت شکن صاحب اور شوکت صدیقی صاحب کا سندھی اور پنجابی کے ساتھ بلوچستانی اور سرحدی کے بجائے بلوچ اور پٹھان لکھنا تسامح ہے یا تجاہل بہر حال اگر بلوچ اور بلوچستانی پٹھان اور سرحدی وغیرہ کے فرق کو سمجھ لیا جائے تو جمالی صاحب کی "مشکل" اور صدیقی صاحب کی "مصیبت" بآسانی دور ہو سکتی ہے۔ یعنی کہ مہاجرین سے سندھی کہلانے کا مطالبہ قومیت بدلنے کا مطالبہ نہیں محض وطن سکنی کی نسبت سے سندھی کہلانے کا تقاضہ ہے۔ جس طرح مرزا داغ فیروز پور جھرکوی کے بجائے دہلوی کہلائے۔ اسی طرح الگ صوبوں کے باشندے مثلاً میاں داد خان سیاح سورتی (گجراتی) اور نگ آباد میں رہائش کی وجہ سے اورنگ آبادی عبدالولی عزلت رائے بریلوی دکنی اور مولانا عبید اللہ سندھی کہلائے۔

وطنیت و قومیت کے باب میں یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ زمانہ سلف سے لے کر آج تک دستاویزات میں منکہ مسمیٰ فلاں ولد فلاں قوم شیخ یا قوم مغل یا قوم راجپوت وغیرہ ہی لکھا جاتا ہے۔ یہی عالم کتب تذکرہ میں نظر آتا ہے ملاحظہ فرمائیں "خدمات شرعیہ دار الخلافہ دہلی مثل قضا و افتا اکثر بہ قوم کنبو تعلق داشت و دارد (خزانۂ عامرہ) اب وطنیت کو لیجئے۔ "ڈپٹی نذیر احمد وطن ریڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور (۲) مولانا ماہر القادری وطن کسیر کلاں پرگنہ ڈبائی تحصیل انوپ شہر ضلع بلند شہر وغیرہ۔ تو کوئی مائی کا لال اس پر معترض نہیں ہوتا۔ نہ کوئی اللہ کا بندہ یہ پوچھتا ہے کہ یہ شیخ اور کمبوہ کن ممالک کی "قومیں" ہیں اور یہ ریڑ و کسیر کلاں کی "مملکتیں" کہاں واقع ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ ملک صوبہ اور ضلع تو کجا تحصیل و پرگنہ کی سطح سے گزر کر کسی چھوٹے سے قصبے یا دیہہ سے "وطنیت" قائم کرنے والے آج پاکستان کے صوبوں سے نسبت سکنی کو ناقابل عمل قرار دے رہے ہیں۔ طرفہ ستم ظریفی یہ کہ خود "تن تنہا پاکستانی" سمجھنے والے تو خیر ان کی پاکستان میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والی نسل بھی اٹاوی اسیٹھوی، آروی، ناروی کہلا رہی ہے۔ یہ کیسی حب الوطنی ہے، یہ کیا تماشہ ہے۔

اندھی اردو پرستی کا ایک شاہکار: محمود شام صاحب فرماتے ہیں —— "سندھ میں یہ جانتے ہوئے کہ دائیں بازو کی جماعتیں کسی لمحہ میں مہاجر سندھی کشمکش پیدا کر کے حالات خراب کر سکتی ہیں۔ اس کے باوجود کسی مہاجر کو گورنر کا مشیر مقرر نہیں کیا جاتا —— اتنی بڑی حق تلفی کیوں؟" (الفتح ۴۲-۲) بائیں بازو والے محمود شام صاحب سے تو دائیں بازو والے ظہور الحسن بھوپالی صاحب ہی اچھے رہے جنہوں نے بھی اعتراض دو ٹوک الفاظ میں کیا تھا کہ "کیوں کسی اردو بولنے والے علاقہ کے مہاجر کو گورنر کا مشیر نہیں بنایا گیا۔؟" کون نہیں جانتا کہ گورنر کے مشیر قاسم پٹیل مہاجر ہی ہیں۔ چونکہ وہ کسی اردو بولنے والے علاقہ سے ہجرت کر کے پاکستان نہیں آئے۔ اس لئے مہاجرین کی لسٹ سے ہی خارج کر دیے گئے۔ محمود شام صاحب تو بادشاہ سے بڑھ کر بادشاہ کے خیر خواہ نکلے۔

باہمی نفاق و افتراق کا یہ سلسلہ ہی کچھ کم تشویش ناک نہیں تھا کہ نوبت جدال و قتال کی دھمکیوں تک جا پہنچی۔ رجعت پسند عناصر اگر سندھیوں کو دھمکاتے ہیں کہ ہمارے آڑے آئے تو ہم کراچی کو الگ مہاجر صوبہ بنا ڈالیں گے تو تعجب نہیں ہوتا لیکن جب رئیس امروہوی ایسا ہوشمند دانش ور اور مدبر سندھیوں کو مبارزت کے لئے للکارے۔

کس جینہ کے ترجماں ہیں آخر
نفرت کے بیان پے بہ پے یہ
ارباب فساد یاد رکھیں
بنگال نہیں ہے سندھ ہے یہ
(جنگ ۹، مارچ ۷۲ء)

تو میں ان کی عزت و احترام کے باوجود خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہوں کہ رئیس صاحب ہوش کے ناخن لیجئے تاکہ پیپلز پارٹی کے مدبروں سے یہ پوچھنے کے بجائے کہ

ع۔ الجھے ہیں کیوں زبان و ثقافت کے حلقے؟

آپ خود ان الجھنوں کی گرہ کشائی کر سکیں (ہر چند کہ اب رئیس صاحب کا لہجہ بدل چکا ہے اور وہ "جیئے سندھ" کا

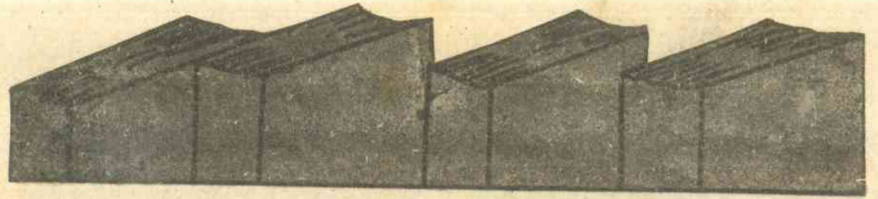
اردو کا غم کھانے والے

سندھی کی زبوں حالی پر

کیوں خاموش ہیں

نعرہ بھی لگا چکے ہیں۔ لیکن لوگ اس تبدیلی کو ان کی ماہیت قلب کے بجائے اخبار کی پالیسی کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ نہیں ہے) مان لیا کہ آپ ڈنڈے کے زور پر اردو زبان اور یوپیئن ثقافت سندھیوں پر مسلط کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سندھ بھی مشرقی پاکستان کے نقش قدم پر چلتا ہوا بھارت کے قدموں میں نہیں جا گرے گا۔ جب کہ علیحدگی پسند پہلے ہی سازشوں میں مصروف ہیں اور پھر اردو کی جبری بالادستی کی خاطر آپ کس کس صوبے سے جھگڑے مول لیتے پھریں گے۔ کیا آپ کے کانوں تک پنجاب سے اٹھنے والی آواز ابھی نہیں پہنچی کہ "اردو کے نام پر پنجابی زبان کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔" گو اس آواز میں وہ شدت نہیں جس کی گونج مشرقی پاکستان کے بعد سندھ میں سنائی دے رہی ہے۔ لیکن ایک ایسے خطے سے جس کی اردو خدمات دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد (دکن) سے کسی طرح کم نہ ہوں اردو کے خلاف اٹھنے والی نحیف سے نحیف آواز بھی بہی خواہان اردو کی فوری توجہ کی طالب ہے۔

اگر ترقی پسند ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اردو کے لئے مشکلات پیدا کرتے رہیں گے۔ تو رجعت پسندوں کی بن آئے گی۔ رجعت پسند خواہ سندھی ہوں یا مہاجر یا کوئی اور ان کا تو منشا ہی یہی ہے کہ دونوں طرف کے عوام زیادہ سے زیادہ ہنگامے بپا کریں تاکہ انہیں کھل کھیلنے کے مواقع ملیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بطور اشلہ اردو کے ترقی پسند اہل قلم حضرات کو پیش کیا ہے۔ مجھے اپنی "تلخ نوائی" کا شدید احساس ہے۔ لیکن جوبات حق سمجھی بے کم و کاست کہہ دی ہے۔ سندھیوں کے بارے میں یہ کہوں گا کہ اس بدنصیب قوم کو کبھی مخلص قیادت نصیب ہی نہیں ہوئی۔ بھٹو صاحب کو یہ اپنا لیڈر تسلیم نہیں کرتے۔ جی ایم سید صاحب ایسے تخریب پسند کے جذباتی نعروں سے مغلوب ہیں۔ جسے موقع پرست ناعاقبت اندیش غیر سندھی عناصر اور شہ دیتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جی ایم سید اور شیخ ایاز صاحبان کے مذہبی اعتقادات اور سیاسی نظریات سے شدید اختلافات کے باوجود اور اردو سے والہانہ لگاؤ کے باوصف میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ رجعت پسند سندھی قیادت کو مواقع فراہم کر کے سندھی عوام کو اس انتہا پسندی پر پہنچانے والا وہ اردو پرست طبقہ ہے جو اردو کو جبراً پاکستان پر مسلط کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر ہمیں اردو سے محبت ہے اگر ہم اردو کے بہی خواہ ہیں۔ اگر ہم اردو کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی جھوٹی انا کی قربانی دینا ہوگی۔ اس خیال کو ذہن سے نکال پھینکنا ہوگا کہ پاکستان میں اردو کے علاوہ اور کسی زبان کو سرکاری مسند پر بیٹھنے کا حق حاصل نہیں۔ ہمیں طنز و تمسخر تضحیک و تنزل کے بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے افہام و تفہیم کے جذبہ سے کام لینا ہوگا۔ مقامی زبانوں سے خلوص و محبت کا عملی ثبوت دینا ہوگا۔ ورنہ اردو اور علاقائی زبانوں کا جھگڑا تو شاید باقی رہ جائے۔ لیکن اس علاقے کے باقی رہنے کا امکان نظر نہیں آتا جس کا نام پاکستان ہے۔



کتابوں پر تبصرہ

متروکات کے مسئلے پر نظر ثانی کی ترغیب مفید ثابت ہوگی

تبصرہ کیلئے دو کتابیں بھیجنا ضروری ہے

تعلیم الکتاب ——— قرآن کریم کا ترجمہ
مترجم ——— سید محمد اویس
ناشرین ——— احمدی بیگم تعلیم الکتاب ٹرسٹ، کراچی
تبصرہ ——— فیض احمد فیض

آج سے چند ماہ پیشتر شان الحق حقی صاحب کے ہاں ایک محفلِ سخن میں سید محمد اویس صاحب سے تجدید ملاقات کا اتفاق ہوا۔ اس محفل میں آپ کے ترجمۂ قرآن کا ذکر آیا تو میں نے بھی دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اویس صاحب کی عنایت ہے کہ آپ نے میری درخواست پر اپنے بعض تراجم اور ان کی اشاعت کے مبسوط مقدمے کے مطالعے سے مجھے کسب لطف و سعادت کا موقعہ دیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی کسی تشریح و ترجمہ پر حرف زنی مجھ جیسے جہلاء کا منصب نہیں اور جن حضرات کا یہ مقام ہے۔ یعنی ملک کے مقتدر علماء۔ وہ اویس صاحب کے ترجمے اور تشریحات کی صحت و خوبی کا اعتراف کر بھی چکے ہیں لیکن دیگر اوصاف و محاسن کے علاوہ کتب مقدسہ عالمی ادب عالیہ کا بھی ایک اہم جزو ہیں اور قبول عام اور عقیدت تمام کے سبب سے مختلف زبانوں کے فروغ اور ارتقاء میں ان کتب کا وجود بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عربی زبان کا بنیادی آہنگ آج بھی وہی ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے قرآن مجید نے متعین کیا تھا۔ اسی طرح اردو نثر کے ارتقاء میں تراجم قرآن کی اہمیت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگرچہ ہمارے مورخان ادب نے اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ اس ضمن میں اویس صاحب نے اپنے مقدمے میں اصولی طور سے اور اپنے تراجم میں عملی امثال سے زبان کے بارے میں چند بہت ہی اہم نکات پر دعوتِ فکر دی ہے۔ جس کا دینی حلقوں کے علاوہ علمی اور ادبی حلقوں میں بھی خیر مقدم ہونا چاہیئے۔

ان میں سے ایک نقطہ متروکات زبان سے متعلق ہے۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں جب امام بخش ناسخ اور بعض دوسرے بزرگ زبانِ اردو کو صاف کرنے بیٹھے اور الفاظ و تراکیب میں متروک اور مروّج کی تفریق پیدا کی تو بد قسمتی سے انہوں نے اس زبان کے مزاج، اس کی تاریخ اور ان مضمرات و ممکنات ارتقاء سے پورا انصاف نہیں کیا اور اپنی ذاتی اور علاقائی پسند و ناپسند کو صحت زبان کا معیار ٹھہرایا۔ اس کے نتیجے میں زبان کی نفاست اور آرائش میں ضرور اضافہ ہوا لیکن اس تناسب سے اظہار کی صلاحیتوں اور آہنگ کے تنوع کا دائرہ سمٹ گیا۔ مثال کے طور پر "آوے ہے"۔ "جاوے ہے" میں صوت اور معنیٰ دونوں کا ایک نازک پردہ ایسا ہے جو "آتا ہے" "جاتا ہے" میں موجود نہیں۔ اویس صاحب نے اپنے ترجمے میں نہ صرف ان متروکات کا استعمال جائز گردانا ہے بلکہ ان کے اصوات و معانی کی پوشیدہ خوبیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً کبھی ایسے ہی احساس کے زیر اثر بعض جدید شعراء نے بھی متروکات کی ضد سے دامن چھڑا لیا ہے اور اپنی منظومات خاص طور سے غزل میں ان کی بعض صورتوں کو بہت سلیقے سے استعمال کرنے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اویس صاحب کی گراں قدر کاوش کے منظر عام پر آنے کے بعد شاید علمی اور ادبی حلقوں میں متروکات کے سارے مسئلے پر نظر ثانی کی ترغیب پیدا ہو، جو بہت مفید بات ہوگی۔

دوسرا نکتہ بھی زبان کے اسی پہلو کے متعلق ہے۔ جب اردو زبان پہلے ریختہ سے اردو اور پھر اردو سے اردوئے معلیٰ بنی تو اس عمل میں وہ الفاظ جو اردو نے علاقائی زبانوں یعنی برج۔ پنجابی۔ دکنی وغیرہ سے اخذ کئے تھے رفتہ رفتہ زبان سے خارج ہوتے گئے اور فارسی و عربی کے مشتقات نے ان مفردات کی جگہ لے لی۔ اس صدی میں جب اردو زبان کو ادبی اظہار کے علاوہ علمی اور صحافتی مطالب بھی ادا کرنے پڑے تو اس عمل میں اور بھی غلو پیدا ہوا اور ہمارے اہلِ علم حضرات و اہلِ قلم حضرات نے ہر نئے تصور کے لئے اپنی بولیوں میں سے کوئی موزوں لفظ تلاش کرنے کی بجائے عربی اور فارسی کتب لغت پر یلغار شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ہماری ادبی زبان روزمرہ بول چال کی زبان سے الگ ہوتی گئی اور دوسری جانب وہ دیسی الفاظ جو بہت سی قومی زبانوں میں مشترک تھے اور اکثر علاقوں میں یکساں سمجھے جاتے تھے۔ ان بدیسی الفاظ و تراکیب کی بھینٹ چڑھ گئے جو صرف ایک محدود علاقے اور محدود طبقے کے لئے قابل فہم تھے۔ اویس صاحب نے اس رسم سے بھی انحراف کیا ہے اور نہ صرف ان پرانے عام فہم الفاظ سے استفادہ کیا ہے۔ جو اردو سندھی، پنجابی، گجراتی حتیٰ کہ بنگلہ میں بھی آسانی سے سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ آج کل کے عوامی روزمرّہ کے برمحل مترادفات سے بھی اپنے قارئین کو روشناس کروانے کی کوشش کی ہے۔ اس اقدام سے بھی پاکستان کی موجودہ لسانی چپقلش کو سلجھانے کے لئے ایک راستے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جس کی جانب ہمارے اربابِ علم کو سنجیدگی سے توجہ کرنی چاہیئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی نئی زبان کی پیدائش ایک تخلیقی عمل ہے۔ جیسے اردو، فارسی اور مختلف پراکرتوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی۔ اسی طرح کسی زبان کا ارتقاء اور اس کے دامن اظہار کا پھیلاؤ بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور چونکہ زبان کوئی جامد شے نہیں اس لئے یہ عمل مستقل کاوش چاہتا ہے۔ چنانچہ الفاظ اور محاورہ روزمرّہ کی صحت متعین کرنے کے لئے روایتی اسناد و تلاش کرنا اتنا مفید یا ضروری نہیں جتنا نئے مطالب کے لئے لغت و محاورہ میں نئی گنجائش پیدا کرنا جو روایت کے وسیلے سے نہیں اجتہاد ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں بھی اویس صاحب نے کافی کامیاب کوشش کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سہولت اور وسعت ابلاغ و تفہیم کے علاوہ جو ہر دینی کتاب کی سب سے مقدم خوبی ہونی چاہیئے۔ اور جو اویس صاحب کے ترجمہ میں بہت احسن طرح موجود ہے۔ آپ نے اس کارِ ثواب میں زبان و بیان کا جو نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر اس کے کلی امکانات کا صحیح جائزہ لیا جائے اور اس جائزے کی روشنی میں ہمارے اربابِ فکر و علم ایک ایسی منظم لسانی تحریک کی ابتداء کریں جس کے ذریعے سے ہر علاقے کے عوام اردو زبان سے اپنے کو قریب تر محسوس کر سکیں تو یہ اہم قومی خدمت ہوگی۔ اگر ایسا ہو سکے تو اس کارِ خیر میں اولیت کا سہرا یقیناً محمد اویس صاحب کے سر رہے گا۔

خیبر سے کیماڑی تک

نوشہرو فیروز

عوامی حکومت کے دور میں بھی حق مانگنا جرم بن گیا

محمد جبرئیل شیخ

عوامی حکومت میں بھی انتقامی جذبے کے تحت کارروائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ نواب شاہ ضلع میں حاجی رحمت اللہ بھن علی احمد میمن و دیگر حضرات اس عمل کا نشانہ بنے ہیں۔

حاجی رحمت اللہ بھن تو خیر مخالف پارٹی کا رکن ہے۔ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ایوب شاہی کے زمانے میں ضلع نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی سے ساز باز کرکے جناب غلام مصطفےٰ جتوئی وزیر مواصلات کے بھائی غلام مجتبیٰ خان جتوئی جو اس وقت ایم پی اے ہیں اور ان کے ماموں جناب حاجی کریم بخش جتوئی سابق چیئرمین ٹاؤن کمیٹی مورو اور ان کے دیگر عزیز دوستوں کے خلاف دفعہ ۱۱۰ کے تحت کارروائی کروائی تھی۔ لیکن جناب غلام مصطفےٰ جتوئی کی خداداد قابلیت کی وجہ سے وہ حضرات گرفتاری سے بچ گئے تھے اور بعد میں ان حضرات نے اپنی ضمانت وغیرہ کروالی تھی۔ لیکن کامریڈ علی احمد میمن تو پیپلز پارٹی کا ایک ذمہ دار عہدے دار ہے۔ وہ نوشہرو فیروز تعلقہ، پیپلز پارٹی کا جنرل سیکریٹری شروع سے لے کر جنوری ۱۹۷۲ء تک ان کی گرفتاری پر یہاں کے عوامی حلقوں میں مختلف باتیں ہورہی ہیں۔ اور اب تحصیل نوشہرو فیروز کے عوام یہ سوچ رہے ہیں کہ موجودہ وقت میں اگر کسی فرد نے موجودہ عوامی حکومت کے وڈیرے یا اُن کے کسی ساتھی کے خلاف آواز اٹھائی تو اسے پابند سلاسل کردیا جائے گا۔

کامریڈ علی احمد میمن معذور ہیں اور ان کی ایک ٹانگ ضائع ہوچکی ہے۔ انہوں نے انتہائی بے باکی سے وڈیرا شاہی کے خلاف بھرپور جد وجہد کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سال ۱۹۷۰ء میں اس تعلقہ کے وڈیروں نے نوکر شاہی کے ساتھ مل کر ایک سازش کے تحت ان پر غنڈہ ایکٹ کے تحت کارروائی کروانے کی ناکام کوشش کی۔ اور اب بھی کامریڈ میمن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ مزدور کسان پارٹی کے رکن ہیں۔ انہوں نے چند دن پہلے ایک وزیر کے خاص دوست وڈیرے رئیس مٹھا خان گوراہو کے کارناموں کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ کیونکہ رئیس موصوف نے تقریباً ۱۳ ہاری خاندانوں کو زبردستی پولیس کی مدد سے بیدخل کرکے ان کی کاشت شدہ زمین پر قبضہ کرلیا۔ ان بے یار و مددگار ہاریوں کے بچوں اور عورتوں کو زبردستی گھسیٹ کر دو دو میل دور چھوڑ آئے۔ ان کا تمام اثاثہ ضبط کرلیا۔ اس سے بھی رئیس موصوف کو چین نہ آیا تو انہوں نے پولیس سے ساز باز کرکے اقدام قتل وغیرہ جیسے مقدموں میں ملوث کردیا اور ہاریوں کو پابند سلاسل کروادیا۔ علاوہ اس کے دوسرا قصور کامریڈ علی احمد کا یہ ہے کہ وہ لوکل کونسلز ورکرز یونین رجسٹرڈ نمبر ۱۱۳۳ (اس یونین میں اکثریت خاکروبوں کی ہے) کا صدر ہے اور ان غریب مزدوروں کے حقوق کے لئے جد و جہد کررہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ماہ مارچ ۱۹۷۲ء میں جب کامریڈ علی احمد نے ہاریوں میں سخت بے چینی پائی اور عوامی حکومت کی زرعی اور لیبر اصلاحات نافذ ہونے کے بعد بھی ان پر مزید مظالم دیکھے تو موصوف نے اعلان کردیا تھا کہ وہ پہلی مئی ۱۹۷۲ء کو آل سندھ ہاری مزدور کانفرنس طلب کررہے ہیں۔ اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنا کام تیز کردیا تھا اور اندازہ تھا کہ کانفرنس تاریخی ہوگی کہ اچانک ایک سیاسی جماعت کی طرف سے ان پر دباؤ پڑنا شروع ہوا کہ ہاری مزدور کانفرنس بلوانے کا ارادہ ترک کردیا جائے۔

کامریڈ علی احمد میمن کی گرفتاری کے بعد یہاں کے عوامی حلقے سخت بے چین ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ کیا پیپلز پارٹی کے وزیر، مشیر، اسمبلی کے ممبر یا ان کے وڈیرے دوستوں کی غلط کاریوں کا پردہ چاک کرنا جرم ہے؟ اگر جرم ہے تو پھر یہ عوامی حکومت کیسی جس میں تنقید کرنا یا اپنا حق مانگنا جرم ہے۔

ساہیوال

عملہ صفائی پر ان کے "ہاتھ کی صفائی" زیادہ دیر نہیں چل سکے گی

ایم علیم چوہدری

بلدیہ ساہیوال نے تقریباً ۷۳۰ افراد پر مشتمل عملۂ صفائی شہر کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے اس عملہ کے سربراہ ایک ہیلتھ افسر ہیں اور انہوں نے اپنی مدد کے لیے تین سینیٹری انسپکٹر اور سات سینیٹری جمعدار رکھے ہوئے ہیں۔ ان سینیٹری انسپکٹروں اور جمعداروں کا کام باقی عملہ کی حاضری لینا اور کام کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔

بلدیہ اس تمام عملۂ صفائی پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ کررہی ہے اور اس کا بظاہر مقصد صرف شہر کی صفائی مقصود ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہورہا۔ شہر کی صفائی کی صورتِ حال روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ جگہ جگہ کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر بلدیہ کا منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ گندہ پانی سڑکوں پر پھیل کر بلدیہ کی "صفائی" کا ثبوت پیش کررہا ہے۔ شہر کے گرد اگرد کئی جوہڑ مچھروں کی افزائشِ نسل کا کام دے رہے ہیں لیکن بلدیہ ساہیوال کے ذمہ دار افسران اس پر کیوں خاموش ہیں؟ یہ ایک سربستہ راز ہے!

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ بلدیہ ساہیوال کے عملۂ صفائی نے اپنے حقوق کے لیے ایک یونین تشکیل دی بلدیہ کے اس وقت کے چیئرمین ملک یوسف نے اسے اپنے لیے چیلنج تصور کیا۔ کیونکہ یونین کی موجودگی میں وہ دھاندلیاں جاری نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا اس نے یونین کو ناکام بنانے کے لیے سازشیں شروع کردیں اور آخرکار وہ خاکروبوں میں سے چند بے ضمیروں کو خریدنے میں کامیاب ہوگیا اور انہیں ترقی کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان بے ضمیروں کی تعداد صرف چھ تھی۔ جنہوں نے اپنی برادری سے غداری کی اور چیئرمین بلدیہ کی انگشت نمائی پر یونین کو ناکام بنانے کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ چیئرمین نے ان کی غدارانہ خدمات کی بناء پر انہیں عارضی سپروائزر مقرر کردیا اور ان کے سپرد یہ کام لگایا کہ وہ باقی تمام عملۂ صفائی کی رپورٹ پیش کیا کریں۔ ان غداروں نے اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ جو خاکروب یونین کی حمایت کرتا اس کی رپورٹ کرکے اس کو حلقہ سے تبدیل کروا دیا جاتا اور کسی دوسرے دور کے علاقہ میں بھیج دیا جاتا تاکہ بے چارہ دو چار میل کا سفر روزانہ کرکے اپنے کام پر جائے اور جو اس ظلم کی شکایت ہیلتھ افسر یا چیئرمین بلدیہ کو کرتا اسے برطرف کردیا جاتا۔

اور یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ بلدیہ کے عملۂ صفائی کے تمام ملازمین عارضی ہیں خواہ وہ ۲۵ سال سے کام کررہے ہوں۔

ایک عام شہری یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اتنا بڑا عملہ رکھنے کے باوجود شہر میں صفائی کا بندوبست مناسب کیوں نہیں ہے ؟ اس کی تمام تر ذمہ داری بلدیہ کے کارپردازوں پر ہے۔ کیونکہ اگر بلدیہ اس بارے میں واقعی سنجیدہ ہو تو ہیلتھ آفسر یا چیئرمین صاحب خود عملہ کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور تمام کام چھ غداروں کے ہاتھ میں ہے۔

بلدیہ میں ان عارضی سپروائزروں کے ذریعے سے جو دھاندلیاں ہو رہی ہیں اس کی ایک معمولی سی مثال دیکھیں آپ حیران ہوں گے کہ ان چھ جمعداروں نے پچاس سے زائد ایسے آدمی عملہ صفائی میں رکھے ہوئے ہیں جن کا کام صرف بلدیہ سے تنخواہ وصول کرنا ہے۔ ان عارضی سپروائزروں کے تمام رشتہ دار بھی بلدیہ کے ملازم ہیں لیکن ان میں سے کبھی بھی کسی نے پوری ڈیوٹی نہیں دی۔ یہاں تک کہ ان کی بیویاں کئی کئی روز کام سے غیر حاضر رہتی ہیں اور ان کا کام یہ سپروائزر دوسرے خاکروبوں سے کرواتے ہیں اور اس طرح یہ لوگ نہ صرف بلدیہ کے لیے بوجھ بنے ہوئے ہیں بلکہ دوسرے خاکروبوں کے لیے "مارشل لا ایڈمنسٹریٹر" بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو خاکروب انہیں ۲۵/۲۰ روپے ماہوار نذرانہ دے دیں۔ اسے کام پر آنے کی کوئی پابندی نہیں۔ علاوہ ازیں کئی افراد ایسے بھی بلدیہ کے ملازم ہیں جو کہ دوسرے محکموں کے بھی ملازم ہیں اور دونوں محکموں سے باقاعدہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ ان تمام بدعنوانیوں اور دھاندلیوں میں بلدیہ کے افسران ملوث ہیں اور اسی وجہ سے کوئی کارروائی کرنے سے گریز کرتے ہیں

بلدیہ کا عملۂ صفائی اپنے افسران اور ان کے مقرر کردہ چھ "مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں" سے سخت نالاں ہے۔ ان مظلوم خاکروبوں کو جنہیں طبی سہولتیں، سستے راشن اور وردی کی سہولتیں بھی میسر نہیں بلدیہ کے استحصال کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ۱۰۸/۰۰ روپے ماہوار تنخواہ میں ۱۶ گھنٹے ڈیوٹی دیتے ہیں اور اس پر ستم یہ کہ بغیر کوئی وجہ بتلائے انہیں کان سے پکڑ کر ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی خاکروب عورتوں کو زچگی کے دوران چھٹی دی جاتی ہے۔ یہ کتنا ظلم ہے انسانیت پر !

تاہم بلدیہ ساہیوال کے افسران کو سمجھ لینا چاہیئے کہ عملۂ صفائی پر ان کے "ہاتھ کی صفائی" اب زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گی !



رکھی گئیں۔ اور انتقامی کارروائیوں کے طور پر جن اساتذہ کو ملازمت سے برطرف کیا گیا تھا۔ انہیں فی الفور واپس ملازمت پر بحال کیا جائے۔ جیسا کہ موجودہ حکومت نے صحافیوں اور مزدوروں کے سلسلہ میں حکم دیا ہے۔

پروفیسر مرزا وسیم بیگ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن گجرات نے کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن راولپنڈی ریجن کے صدر چوہدری فضل حسین کو بھی سراسر انتقامی کارروائی پر کالج سے برطرف کر دیا تھا۔ جب کہ اس وقت کی حکومت نے بھی ایک آرڈی ننس جاری کر رکھا تھا جس کے تحت وہ کسی ٹیچر کو برطرف نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن کالج انتظامیہ نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر زمیندار کالج کے سینئر ترین پروفیسر کو برطرف کر کے کالج کے ماحول کو مستقل طور پر ناساز گار بنا دیا ہے۔ اور طلباء اب تک اپنے عظیم اساتذہ کی بحالی کے سلسلہ میں آئے دن کالج میں ہڑتال کر دیتے ہیں۔ جس سے ملک و قوم کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔

وسیم بیگ مرزا نے کہا کہ اگر موجودہ حکومت نے بھی ہماری دردمندانہ اپیل پر ہمدردانہ غور نہ کیا تو بالآخر ہم بھی کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے متعلق سوچیں گے۔

گجرات

زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

طارق جاوید چوہدری

اس امر سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا کہ نجی تعلیمی اداروں نے ملک کی تعلیمی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جن مخیر حضرات نے ان کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ قومی خدمت اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ماضی میں پرائیویٹ کالجوں کے نتائج سرکاری کالجوں کے نتائج سے بہتر ہوا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے تقسیم ملک کے بعد ان اداروں کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ آئی ہے وہ خلوص سے عاری اور تاجرانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں اقبالؒ کا مصرعہ بالکل صادق آتا ہے۔

"زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن"

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مفید تعلیمی ادارے اب تیزی سے روبہ انحطاط ہیں اور ان سے وابستہ اساتذہ شدید قسم کے ذہنی کرب اور ناقابل بیان معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔ عوام کے پرزور مطالبہ پر حکومتوں نے وقتاً فوقتاً ان اداروں کی حالت سدھارنے کے لئے اقدامات کئے۔ مگر عیار منتظمین کے منفی ہتھکنڈوں کے سامنے یہ اصلاحات مزید بگاڑ کا باعث نہیں۔ یہاں تک کہ جون ۱۹۷۰ء میں نافذ ہونے والا آرڈی ننس جو باوجود خامیوں کے اپنے اندر افادیت کے کئی پہلو لئے ہوئے تھا۔ ان اجارہ داروں کی ملی بھگت اور مکروہ سازشوں کا شکار ہو گیا۔

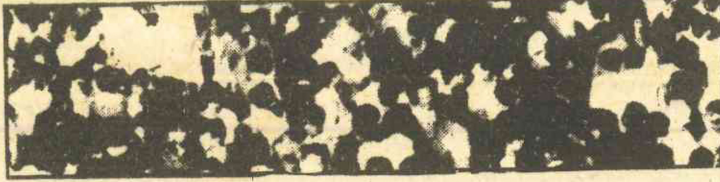
پچھلے دنوں یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن راولپنڈی ریجن کے جنرل سیکرٹری مرزا وسیم بیگ نے کہا کہ موجودہ ارباب اختیار کے خوش آئند بیانات سے اب ہمیں یہ توقع ہو چلی ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں عوامی حکومت ان تعلیمی اداروں کی کارکردگی بہتر بنائے اور اساتذہ کو تحفظ ملازمت و دیگر مراعات و حقوق دلانے کے لئے مؤثر اقدامات کرے گی۔ لیکن سابقہ چند برسوں میں اساتذہ کے نمائندوں پر جو مظالم توڑے گئے اور جو بے انصافیاں روا

کراچی

یہ دہریہ ہے، کافر ہے، ملحد ہے
جماعت اسلامی کا پرانا حربہ

بانٹو میمن والنٹیئر کورپس ایک رفاہی انجمن ہے۔ ۲۰ سال سے بولٹن مارکیٹ اور لیاری کے غریب عوام کے لئے رفاہی کام کر رہی ہے۔ انجمن کے صدر مولانا عبدالستار اس علاقے کے جانے پہچانے سوشل ورکر ہیں۔ ان کی ساری زندگی غریب عوام کی خدمت میں گزری ہے۔ ملیشیا کے سادہ کپڑوں میں ملبوس مولانا ستار کے بارے میں علاقہ کے غریب لوگ بے انتہا عقیدت رکھتے ہیں۔ مولانا نے بہت عرصے سے اس علاقے کے سرمایہ داروں کے نام نہاد رفاہی اداروں کے خلاف بھی مہم چلا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے کنونشن لیگی جماعت اسلامی کے کارندے اور سرمایہ داروں کے ایجنٹوں نے مولانا کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کئے ہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم نیشنل لیبر فرنٹ نے نہایت ہی گھناؤنے انداز سے مولانا کے یہاں کام کرنے والے چند افراد کی یونین بنا کر

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں



قارئین کہتے ہیں

اب تو "صالحین" بھی ترقی پسند ہوتے جا رہے ہیں

گزشتہ دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکرٹری جناب قمر ہاشمی نے انجمن پر سے پابندی ہٹانے کے لیے صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو سے درخواست کی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ عام اجلاس کی اجازت دی جائے۔ اس پر جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ جسارت کے کالم نگار نے اس بیان کی آڑ میں جو کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہ صرف میری بلکہ متعدد رفیقوں کے بصد تحقیق و جستجو بھی پلے نہیں پڑی! جہاں تک فیض احمد فیض کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی وہ آج سے نہیں عرصہ ہائے دراز سے جاری ہے لیکن افسوس کہ یہ رجعت پسند مولوی آج تک کچھ بھی نہ کر سکے۔

میں نے "الفتح" کے کسی شمارے میں پڑھا تھا کہ فیض صاحب قرآن شریف کا نہ صرف مطالعہ کرتے ہیں بلکہ انہیں قرآن شریف کا کچھ حصہ حفظ بھی ہے۔ اور مولوی کافر کا فتویٰ دے کر ظاہر ہے کیا بگاڑ سکتا ہے؟ مولویوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف جو فتویٰ دیا تو ۱۲۵ سیٹوں کا خواب ادھورا رہ گیا۔

آیئے ذرا ان "صالح" ادیبوں اور شاعروں کا جائزہ بھی لیں۔ سرسری طور پر یہ جائزہ صرف ذاتی مشاہدات ہیں۔

——— ایک صاحب ہوا کرتے ہیں چہرے پر خشخشی داڑھی، شیروانی، پاجامہ اور پان سے منہ لال، آنکھوں میں کاجل غضب کا اور اندازِ گفتگو بالکل ایسا جیسے تیسری صنف کا کوئی جنا! بدقسمتی سے ناکارہ ہونے کے باوجود مہارت کا ثبوت دینے پر تلے رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں جدن بائی کا اور طوائفوں کا تذکرہ جس خوبی سے کرتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ واہ واہ کے ڈونگرے برسائیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اپنا رسالہ بھی ہے جس میں جماعت کی طرف سے اشتہارات مل جاتے ہیں زیادہ مضامین خود اپنے ہی شائع کرتے ہیں! نوجوانوں میں خالص رومانی شاعری کرتے ہیں اور "تصوف" کا درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی ہوا کرتے ہوں گے اب تو "صالحین" میں شامل ہیں۔ اس لیے محض ہاتھ پھیلانے کی بات کرکے دل خوش کرتے ہیں۔ پتہ نہیں "کلو واشرلو" پر عمل ہوتا ہے کہ نہیں ——— !! قارئین پہچان گئے ہوں تو اچھا ہے ورنہ پھر! خیر چھوڑیئے۔ مولانا خود ہی اپنا چہرہ دیکھ لیں کافی ہے!

یہ ہیں تنقید نگار، شاعر، ڈرامہ نویس اور بذات خود بھی ڈرامہ شاعر تو ہیں مگر ڈرامہ نویسی میں ترجمے نے بڑا سہارا دیا ہے۔ بقول ان کے دوسروں کی لکھی ہوئی چیز اپنے نام سے لکھتے ہیں۔ بڑے بھائی کی وجہ سے خود بھی تنقید نگار بن گئے اور خیر سے اب دانشور بھی! ان کی عقلِ سلیم کا یہ عالم ہے کہ اذان سن کر گھر سے نکلا کرتے تھے نماز پڑھنے اور پہنچ جاتے تھے کیفے ٹیریا شام منانے کے لیے! جی ہاں اپنے پیسوں سے اپنے اعزاز میں شام کا اہتمام اور پھر مولانا سے آزاد نظمیں کہلواتے تھے!

بیچارے کچھ دن روبرو رہے پھر غیر حاضر ہو گئے شاید "صالح" ہونے پر شک کیا گیا تھا۔

اور یہ ان کے بڑے بھائی ہیں بیچارے نئے دَور میں آئے تھے اور پرانے دَور کے ہو کر رہ گئے۔ تنقیدی نشستوں میں اسپرو کی گولی پہلے کھاتے ہیں۔ صدارت کا انہیں بھی شوق ہے۔ رائٹرز گلڈ میں بڑی کوشش کی لیکن رجعت پرستی اور ازلی بزدلی آڑے آ گئی۔ کالج کے کتب خانے میں محبوس رہتے ہیں اور نکتہ شناس ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن تمام نکات جماعت کی شکست کے بعد بھول گئے خدا ہی خیر کرے!

آجکل ترقی پسندی کا سلسلہ کچھ ایسا چل نکلا ہے کہ "صالحین" بھی ترقی پسند ہوتے جا رہے ہیں۔

(ابنِ عبداللہ علیگ۔ نیو کراچی)

کلرکوں کے ساتھ ناانصافی

کلرک طبقہ کی اس بے بسی کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کروں گا جس کی وجہ سے وہ اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ افسر شاہی کے نت نئے نشانے بنتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ہفت روزہ میں ان نکات پر بھی تبصرہ و تنقید فرمائیں گے جن کی وجہ سے یہ طبقہ بے بس ہو کر رہ گیا ہے وہ نکات یہ ہیں:

(۱) پرسنل فائل

(۲) بات بات پر میمورنڈم

(۳) خوشامد نہ کرنے پر ذہنی سزائیں

(۴) دور دراز علاقوں میں تبادلے

ہمارے سرکاری و نیم سرکاری دفاتر و اداروں اور کارپوریشنوں میں کسی کلرک کی شخصیت کو جانچنے کے لیے پرسنل فائل کے اوراق بطورِ پیمانہ استعمال ہوتے ہیں۔ چاہے کلرک بیچارہ کتنا چیخے چلائے، اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کرے۔ لیکن پرسنل فائل کے اوراق کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کا کمزور پہلو یہ ہے کہ بعض خوددار قسم کے کلرک خوشامدیوں کے مقابلے میں اپنی تمام تر محنت و ایمانداری کے باوجود اگر اپنے متعلقہ افسر کی جی حضوری نہیں کرتے تو مذکورہ افسر کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ کلرک کی ذرا سی غلطی پر اس کی پرسنل فائل پر ایسے خوفناک میمو لگا دے جس سے اس کا آئندہ مستقبل یقیناً متزلزل ہو سکتا ہے۔ پھر ستم در ستم یہ کہ کلرک بیچارے کو اس بات کی اجازت تک نہیں ہوتی کہ وہ افسرانِ بالا کو اپنی مشکلات لکھے بلکہ شکایات یا مشکلات "تھرو پراپر چینل" کے اصولوں پر دینے کا رواج ہے۔ یعنی کلرک مزید پھنس جاتا ہے اور اسے متعلقہ افسر کی سزاؤں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ کلرک کو سزا کے طور پر دور دراز کے علاقوں میں ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے جس سے اسے مزید ذہنی کوفت پہنچتی ہے دماغی سکون کا فقدان ہو جاتا ہے ہر افسر پرسنل فائل کے کاغذات کو پڑھ کر کلرک کی بدقسمتی کا آغاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ کار سراسر کم تنخواہ یافتہ

کلرکوں پر ظلم کے مترادف ہے۔ ایک افسر ہمیشہ اپنے ہم عصر افسر کو سچ گردانتا ہے۔

(ایک کلرک ـــــ کوئٹہ بلوچستان)

نمازی کھارے پانی سے وضو کرتے ہیں

میں گورنر سندھ کی توجہ گرین ٹاؤن کی طرف دلانا چاہتی ہوں۔ گورنر صاحب! اس بستی کو آباد ہوئے کوئی آٹھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اس زمین کا ہم لوگوں نے عوامی حکومت کے آنے سے پہلے ٹیکس ادا کیا تھا۔ اب کوئی کہتا ہے کہ جس نے پہلے ٹیکس دیا تھا اس کے پیسے گئے۔" کوئی کہتا ہے کہ "نہیں! آپ لوگوں نے ٹھیک دیئے تھے۔"

آپ ہم پریشان لوگوں کی مشکل آسان کریں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے حکومت کو اس زمین پر اس وقت تک ٹیکس لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جب تک حکومت پانی، بجلی، سڑک، گورنمنٹ اسکول، بسیں جیسی بنیادی چیزیں عوام کو فراہم نہیں کرتی! ایک تکلیف ہو تو بیان کریں۔ بے شمار مسائل ہیں۔ یہاں ایک بھی گورنمنٹ اسکول نہیں ہے۔ ویسے پرائیویٹ اسکولوں کی بھرمار ہے۔ ان پرائیویٹ اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیاں اکھٹے ہی پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے بعض والدین اپنی لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجتے۔ اس طرح بہت سی لڑکیاں تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔ دوسری بات برسات کے دنوں میں بارش کا پانی اسکول کے گیٹ پر جمع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت دنوں تک اسکولوں میں چھٹی رہتی ہے

تیسری بات، گرین ٹاؤن میں ایک مسجد ہے ہر لوگ باقاعدگی سے مسجد کو چندہ دیتے ہیں اور بچوں کو قرآن پاک پڑھنے کا ایک روپیہ فی کس فیس علیحدہ دیتے ہیں مگر پھر بھی مسجد کی وہی حالت ہے جو اب سے چار سال پہلے تھی۔ افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب نمازی کھارے پانی سے وضو کرتے ہیں۔ ایک مشکل اور ہے کہ خدا کے اس مبارک گھر میں بجلی بھی نہیں ہے۔ رمضان مبارک کے مہینے میں تو نمازی حضرات کو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ایک گیس جلتا ہے۔ بتائیے کہ ایک گیس کے جلنے سے کیا ہوگا۔ اس مسجد کی چھت بھی نہیں ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو ہم لوگ دل و جان سے آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔

خدا آپ کو سلامت رکھے!

(رشیدہ ابراہیم گھانچی۔
گرین ٹاؤن کراچی)

آئندہ شمارے میں

پیپلز پارٹی کی تنظیم ـــــ عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں۔

کے عنوان کے تحت

سید اختر حسین جنرل سیکرٹری ڈرگ ملیر حلقہ نمبر ۱۵، اور محمد طفیل صدر پیپلز پارٹی میاں میر (لاہور) کی رائے ملاحظہ فرمائیں۔

بقیہ: خیبر سے کیماڑی تک

یہ کوشش کی کہ مولانا ستار کو اس انجمن نکالا جائے۔ اور ان پر الزام لگایا کہ یہ دہریہ ہے اور مسلمانوں کو گالیاں دیتا ہے۔ جب کہ کسی بھی رفاہی ادارہ میں جو کہ تجارتی بنیادوں پر نہیں چلایا جاتا ہے۔ یونین بنانے کا کوئی قانون نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بولٹن مارکیٹ کے بااثر سرمایہ دار خود ساختہ یونین کے عہدیداروں کی بے انتہا مالی امداد کر رہے ہیں۔ یونین کے نمائندوں نے حلف ایک نام نہاد پیر کے سامنے اٹھایا اور عہد کیا کہ ہم جب تک اس سوشلسٹ کو بولٹن مارکیٹ سے نہیں نکال لیں گے۔ خاموش نہیں رہیں گے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان بھی اس سلسلے میں کئی دفعہ مولانا عبدالستار کے دواخانہ پر مظاہرہ کر چکے ہیں۔

بقیہ: سابق ایئر مارشل رحیم خاں

وزنی بم گرادیے۔ جس سے ایک "ڈمی اسٹار فائٹر" سے شعلے بھڑک اٹھے۔ ایک بھارتی طیارہ، طیارہ شکن بندوقوں کی فائرنگ سے تباہ ہوگیا۔

پاکستانی طیاروں نے بھارتی طیارہ کا تعاقب شروع کر دیا اور وہ تیزی سے چکر کاٹتا ہوا فرار کی راہیں تلاش کر رہا تھا پوری فضاء لڑاکا طیاروں کی دھاڑ اور چنگھاڑ سے گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس بار پاکستان کے طیارے بھارتی طیارے کو للکارتے ہوئے دہلی پہنچ جائیں گے۔

ایئر مارشل خان نے مسکراتے ہوئے کہا "ہمارے لڑکوں نے اچھی شوٹنگ کا مظاہرہ کیا ـــــ اور لعل ـــ" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور بھارتی بم سے پیدا ہونے والے گڑھے کا معائنہ کرنے لگے۔

انہوں نے کہا ـــــ "بدقسمتی سے میرا ویڈیو خراب ہو گیا اگر میرا ویڈیو کام کرتا تو یقیناً لعل کے لڑکے بچ کر نہ جاتے۔ اس اڈے کے پائلٹ درحقیقت بہت اچھے ہیں۔"

مرے سیوائل کے مطابق اس نے رپورٹ تیار کر کے بھیجی لیکن اس کی رپورٹ اس طرح لندن نہ پہنچ سکی۔ سنسر کی نذر ہوگئی۔

بقیہ: پیپلز پارٹی کی تنظیم

اور سیکرٹری ڈویژن کے صدر اور سیکرٹری کا چناؤ کریں اسی طرح سے صوباتی اور مرکزی چناؤ ہونے چاہیئے اور اسی طرح سے مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہونے چاہیئے۔ جو عہدہ دار کسی سرکاری عہدے پر چلے جائیں ان کو پارٹی کی تنظیم سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔

(۲) یہاں لائلپور کے سٹی چیئرمین نے ایک بیوہ کا مکان اپنے کسی عزیز کو زبردستی دلوا دیا اور الٹا اس بیوہ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اس بات کا علم لوگوں کو اس جلسہ عام میں ہوا جب بیوہ نے اسٹیج پر چڑھ کر چیئرمین صاحب کو گلے سے پکڑ لیا۔ اسی طرح ایک ڈرائیور کو ہم نے ایک ایم۔این۔اے کے پاس بھیجا کہ ان کی ضمانت سے اس غریب کا کام بن جائے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ "بس والے ... روپے کی ضمانت مانگتے ہیں"۔ اس نے کہا، کہ حضور میرے پاس اگر اتنے پیسے ہوتے تو پھر مجھے آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہوتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے ایک لاکھ روپیہ الیکشن پر خرچ کیا ہے"

(۳) میرے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔ جس طرح عوامی جمہوریہ چین میں ہے یعنی پارٹی اپنی مرضی کے مطابق اپنے کارکنوں کو سرکاری محکموں میں بھیجے

(۴) میرے ایک عزیز کا کسی دوسرے فریق کے ساتھ جھگڑا تھا۔ بات تھانے تک پہنچ گئی اور ہم تھے بھی حق پر، لیکن ایک مقامی ایم پی اے نے مخالف گروپ کے کہنے پر میرے عزیز کو گرفتار کروا دیا اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے ڈھٹائی سے ہماری حمایت شروع کر دی یعنی بلا سوچے سمجھے دو مخالف گروپوں کی طرف سے سفارشیں کرتے رہے۔

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا بیباک ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۲ مئی ۱۹۷۲ء کو اپنی دوسری سالگرہ پر * حسبِ روایت ایک اہم اور تاریخی

سالنامہ

پیش کر رہا ہے

لکھنے والے

- فیض احمد فیض • احمد ندیم قاسمی • قدرت اللہ شہاب • صفدر میر • ابراہیم جلیس • شوکت صدیقی
- میجر اسحاق محمد • ایم مسعود • ایرک سپرین • ابنِ انشا • جمیلُ الدین عالی • عبدالحمید عدم • قتیل شفائی
- خالد علیگ • فارغ بخاری • ہاجرہ مسرور • محسن بھوپالی • ظفر اللہ پوشنی • زاہد ملک • اقبال میر
- خدیجہ مستور • حسن عابدی • ایم جے زاہدی • منہاج برنا • افضل صدیقی • زین الدین خاں لودھی • عثمان بلوچ
- واحد بشیر • نبی احمد • علی احمد • عابد زبیری • انور سجاد • اور بہت سے دوسرے حضرات •

ایجنٹ حضرات اور مشتہرین کرام نوٹ فرمالیں

صفحات : — ۲۰۰ قیمت : — ۲ روپے

جنرل منیجر ہفت روزہ الفتح ، ۸۰ ڈی نرسری کمرشیل ایریا کراچی ۲۹

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
27 APRIL – 4 MAY, 1972

Haqqi Offset Press Karachi.